# مطالعۂ پاکستان

برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

برائے

انٹرمیڈیٹ کلاسز

ناشر

**نوید پبلیکیشنز** لاہور۔

برائے

**پنجاب ٹیکسٹ بُک بورڈ — لاہور**

| ایڈیشن | طباعت | تاریخ اشاعت | تعداد اشاعت |
|---|---|---|---|
| دوم | سوم | مئی 1996ء | 40 000 |

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور محفوظ ہیں۔

تیار کردہ: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

منظور کردہ: وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد۔

بموجب مراسلہ نمبر ایف 5-2/84- (ایس ایس) بتاریخ 29 جنوری 1985ء بحیثیت واحد نصابی کتاب برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز صوبہ پنجاب اور آزاد جمّوں و کشمیر۔

مدیر : مسز شفقت افتخار

نگران طباعت : مسز شفقت افتخار

محمد الیاس انجم

مہر صفدر ولید صفدر

ناشر: نوید پبلیکیشنز ۶۳۔ شاہراہِ قائدِاعظم لاہور۔

مطبع: نیئر اسد پرنٹرز، ریٹی گن روڈ، لاہور

# فہرست اسباق

"وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں؟
وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے
جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ' وہ چٹان' وہ لنگر خدا کی
کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے' ہم میں
زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا"۔

(قائد اعظم محمد علی جناح کا مسلم لیگ کے اجلاس
منعقدہ کراچی 1943ء کے موقع پر خطاب)

بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

# قیامِ پاکستان

پاکستان 14 / اگست 1947ء کو عالمِ وجود میں آیا۔ اس کے قیام کے مقاصد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد کا جائزہ لیا جائے اور اس فکری، سماجی و مذہبی انقلاب کو سمجھا جائے جو اس علاقے کے معاشرے میں اسلام کی بدولت رونما ہوا۔ یہی حالات تحریک پاکستان کا اصل پس منظر ہیں۔

عرب تاجر قدیم زمانے سے اپنے تجارتی لین دین کے سلسلے میں جنوبی ایشیا میں آتے جاتے تھے۔ اسلام آنے کے بعد، انھی تاجروں کے ذریعے دین اسلام کا پیغام بھی اس علاقے تک پہنچا۔ مقامی لوگ اس پیغام سے متاثر ہوئے مگر باقاعدہ اشاعت اسلام کا سلسلہ محمد بن قاسم کے حملہ سندھ کے بعد ہوا۔ محمد بن قاسم نے راجا داہر کو 712ء میں شکست دی۔ اس کے بعد بزرگانِ دین کی جنوبی ایشیا میں آمد شروع ہوئی۔

**اسلام سے پہلے جنوبی ایشیا کی حالت :** برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہ سارا علاقہ چھوٹی بڑی کئی حکومتوں میں منقسم تھا۔ یہ حکومتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں جس کی وجہ سے سیاسی اور جغرافیائی تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہتی تھیں، یوں سارا علاقہ سیاسی انتشار کی نذر ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے لوگوں کی مجموعی ترقی پر منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔

جنوبی ایشیا کی تاریخ میں ایک ایسا دور آیا تھا جب کہ بدھ مت اس علاقے کا سب سے بڑا مذہب بن گیا، مگر مسلمانوں کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے بدھ مت مغلوب ہو چکا تھا چنانچہ اس عہد

کے ہندو حکمران، ہندو مت کے پر جوش حامی تھے اور انھوں نے بدھوں پر سختیاں کیں۔ سندھ کے ہندو راجا داہر کے ناروا سلوک کی وجہ سے ہی اس علاقے کی بدھ آبادی مسلمانوں کی آمد کی طالب ہوئی۔

ہندو معاشرہ، سماجی ناانصافی اور بندشوں کا مجموعہ تھا۔ قدیم زمانے سے پورا ہندو سماج چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اسے ذات پات کی تقسیم کہا جاتا ہے۔ چار بڑی ذاتیں یہ تھیں:
(1) برہمن۔ (2) کھشتری۔ (3) ویش۔ (4) شودر۔

برہمن، مذہبی طبقہ کے افراد تھے۔ یہ لوگ مذہبی علوم اور رسومات کے ماہر تھے، اس لیے انھیں مقدس اور قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ کھشتری وہ تھے جن کے ذمے ملک و قوم کا دفاع اور امن و امان کا قیام تھا۔ راجے، امرا، فوجی اور دیگر حکام اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دو ذاتوں کو بلند مقام حاصل تھا۔ باقی دو ذاتیں، ویش (کاشت کار، تاجر، صنعت کار، کاری گر وغیرہ) اور شودر (جن کا کام باقی ذاتوں کی خدمت بجا لانا تھا) نہایت ذلت و رسوائی کی زندگی گزار رہی تھیں۔ انھیں بنیادی حقوق حاصل نہیں تھے، یہاں تک کہ قانون کی نگاہ میں بھی وہ اونچی ذاتوں کے برابر نہیں تھے۔ اگر کوئی شودر مقدس ویدوں کا کوئی لفظ سن لیتا تو اس جرم کی پاداش میں اس کے کان میں گرم سیسہ ڈال دیا جاتا۔ شودر بالعموم شہر کی چار دیواری سے باہر رہتے تھے۔ مختلف ذاتوں میں باہمی شادی بیاہ کا رواج نہیں تھا۔ ذاتیں موروثی تھیں، اس لیے ان سے کسی صورت بھی چھٹکارا ممکن نہ تھا۔

تنگ نظری نے ہندو سماج کو مفلوج کر رکھا تھا۔ عورت کو کم تر مقام دیا گیا تھا۔ بیوہ کی دوبارہ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ عام طور پر بیوہ کو خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ اس رسم کو ستّی کہتے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کی جنوبی ایشیا میں آمد اور ان کے ایک دوسرے سے تعلقات خصوصاً مقامی لوگوں کے ساتھ سلوک نے ہندو سماج کے نچلے طبقے کے لوگوں کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

## اسلام کے جنوبی ایشیا کے معاشرے پر اثرات:

**تہذیبی اثرات:** جنوبی ایشیا میں آنے سے پہلے مسلمان دیگر مہذب دنیا کے اکثر و بیشتر حصے پر چھا چکے تھے، اس لیے ان کے علوم و فنون اور تمدن میں قریباً ساری مہذب دنیا کی تمدنی

خصوصیات موجود تھیں۔ مسلم تہذیب نہایت بلند پایہ حیثیت رکھتی ہے' اس لیے اس نے جنوبی ایشیا کی پسماندہ تہذیب کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے خدوخال میں اہم مثبت تبدیلیاں پیدا کیں۔

**سیاسی اثرات :** (i) مسلمان جہاں بھی گئے' انھوں نے مضبوط مرکزی حکومت کو رواج دیا اور چھوٹی چھوٹی مقامی حکومتیں ختم ہوتی گئیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک لمبے عرصے تک سارے شمالی برصغیر کو بھی ایک مرکزی حکومت کے ماتحت رکھا اور سارے علاقے میں اندرونی امن و امان بحال کر کے بدامنی کو کچل دیا۔ یوں ایسے حالات پیدا ہوئے جن سے تمدنی ترقی میں ہمیشہ مدد ملتی ہے۔

(ii) سیاسی وحدت کے ساتھ ساتھ انتظامی یکسانیت بھی قائم ہوئی۔ مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں اعلیٰ نظام حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس نظام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ شمالی برصغیر کے وسیع علاقے میں ایک ہی طرز کا نظام قائم تھا۔ اس انتظامی یکسانیت نے اس علاقے کے مختلف حصوں میں معاشرتی ہم آہنگی پیدا کی۔

(iii) جنوبی ایشیا کے مسلم فاتحین ایک بڑے اسلامی معاشرے کا حصہ تھے جس سے وہ بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے' اس لیے ان کی آمد سے بیرونی دنیا کے ساتھ جنوبی ایشیا کے تعلقات قائم ہو گئے۔

(iv) فنون جنگ نے بہت ترقی کی۔ اگرچہ اسلحے میں زیادہ فرق نہیں تھا مگر مسلمانوں کی جنگی تدابیر' نظم و ضبط اور لڑنے کا طریقہ ایسا تھا کہ تعداد میں کئی گنا زیادہ دشمن پر فتح پا جاتے تھے۔ اس علاقے میں بحری فوج کی ابتدا بھی اسی زمانے میں ہوئی اگرچہ اس شعبے میں جنوبی ایشیا کے مسلمان زیادہ ترقی نہ کر سکے۔

**معاشرتی اثرات** (i) جس طرح مسلمانوں کی آمد سے سیاسی وحدت اور انتظامی یکسانیت پیدا ہوئی' اس طرح سارے ملک کے طرز معاشرت میں بھی یک جہتی پیدا ہو گئی۔ سماج کے اعلیٰ طبقوں نے مسلمانوں کا انداز زندگی اختیار کیا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو' لباس کے معاملے میں سلیقہ مند نہ تھے۔ وہ اپنے جسم کو ایک یا دو چادروں سے ڈھانپ لیتے تھے۔ مسلمانوں نے پہلی دفعہ لباس سینے کا طریقہ رائج کیا جو زیادہ باپردہ اور زیادہ خوبصورت تھا۔

(ii) مسلمانوں نے تمام ملک میں امن و امان قائم کیا' اس سے شاہراہیں محفوظ ہو گئی تھیں۔ تجارت و صنعت کو بہت ترقی ہوئی۔ بحری تجارت اپنے عروج کو پہنچی اور دور دراز ممالک کے ساتھ تجارتی روابط قائم ہو گئے۔ یوں جنوبی ایشیا میں خوش حالی کا دور دورہ ہو گیا۔

(iii) اسلام انسانی مساوات اور سماجی انصاف کا علم بردار ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی آمد سے اس خطے کے عوام کو ہندو سماج کی ناانصافیوں سے بڑی حد تک نجات مل گئی۔ ذات پات کی چکی میں پسنے والے پسماندہ طبقے نے سکھ کا سانس لیا اور اپنی آزاد مرضی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔

**تمدنی اثرات** (i) فنون لطیفہ کی جملہ شاخوں نے خوب ترقی کی۔ اسلامی آرٹ میں پہلے ہی مصرو روما اور یونان و ایران کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔ اب اس میں جنوبی ایشیا اور چینی مصوری کے نمونے بھی شامل ہو گئے۔ یوں ایک نئے آرٹ کی بنیاد پڑی جسے "انڈو اسلامک آرٹ" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

(ii) فن تعمیر کا بالکل نیا اور اچھوتا انداز ابھرا۔ اس فن میں مسلمانوں کا ذوق سلیم مشہور ہے۔ وہ جہاں بھی گئے' انھوں نے ایسی نادر عمارات چھوڑیں کہ وہ آج بھی ماہرین فن سے داد تحسین وصول کر رہی ہیں۔ جنوبی ایشیا میں بھی مسلمانوں نے بے شمار حسین عمارات تعمیر کیں جن کے بلند و بالا مینار اور خوبصورت گنبد و محراب ان کے اسلامی تشخّص کی نشاندہی کرتے ہیں۔ (تفصیل اسی کتاب کے پانچویں باب میں درج ہے)

اس کے علاوہ دوسری صنعتوں مثلاً شال سازی' قالین بانی اور ململ بانی کو بھی مسلمانوں ہی نے ترقی دی تھی۔

(iii) مسلمانوں کی فوج میں مختلف قومیتوں کے لوگ شامل تھے۔ ان کے باہمی میل جول سے رفتہ رفتہ ایک عام مشترکہ ملکی زبان وجود میں آئی جسے اُردو کا نام دیا گیا۔ یہ بھی ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ اس سے جنوبی ایشیا کے مختلف حصوں سے تعلق رکھنے والے عوام ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور ان کے مابین میل جول و مفاہمت میں اضافہ ہوا۔

(iv) مسلم سلاطین کی سرپرستی میں علم و ادب نے بڑی ترقی کی۔ قیام امن اور خوش حالی پیدا کر کے مسلم حکومت نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے جن میں علوم و فنون از خود ترقی کرتے

ہیں۔

**مذہبی اثرات** (i) اسلام سے پہلے جو مذاہب باہر سے جنوبی ایشیا میں آئے، انھوں نے اپنی جداگانہ حیثیت کھو دی اور ہندو مت میں جذب ہو کر رہ گئے، مگر اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے، اس لیے جہاں بھی اس کی صدائے حق پہنچی، مقامی افکار و اوہام اس کے زیر سایہ آتے گئے۔ ایسا دین، ہندو مت جیسے جامد مذہب سے متاثر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس یہاں اسلام نے اپنا رنگ جما لیا اور اسلامی تعلیمات کے محاسن سے متاثر ہو کر بہت سے ہندو مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔

(ii) اسلامی توحید اور مساوات کے اثرات اس قدر غالب تھے کہ خود ہندو مت میں ایسے بھگت پیدا ہونے لگے، جنھوں نے بت پرستی سے نفرت کا اظہار کیا اور ذات پات پر کڑی نکتہ چینی کی۔ یوں ہندو مت میں اصلاحی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ اس میدان میں نامور صوفیا و مشائخ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ان بزرگوں میں بعض صاحب تصنیف عالم بھی تھے جنھوں نے اپنے قلم سے معارف تصوف پر روشنی ڈالی۔ صوفیا کے گروہ نے تبلیغ اسلام میں بہت حصہ لیا۔ ان کی پاکیزہ زندگی، بلند کردار اور حسن اخلاق سے لوگ خود بخود کھنچے چلے آتے تھے۔ مسلم معاشرے کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

ابتدا میں جنوبی ایشیا میں آنے والے بزرگوں میں حضرت علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) کا نام قابل ذکر ہے۔ بعد میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ تشریف لائے۔ ان کے خلفاء نے جنوبی ایشیا کے کونے کونے میں اسلام کا پیغام پہنچایا۔ سلسلہ سہروردیہ حضرت بہاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کی قیادت میں پھلا پھولا۔ سلسلہ قادریہ کے بزرگوں کا مرکز اُچ شریف تھا۔ پھر سلسلہ نقشبندیہ کے بزرگ آئے۔ اس سلسلے کے حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مسلم معاشرے کو ہر قسم کی آلائشوں اور غلط افکار سے پاک کرنے کی سعی کی۔ حضرت عثمان مرندی جنھیں عرف عام میں حضرت لال شہباز قلندرؒ کہتے ہیں، نے بھی اس سلسلے میں بیش قدر خدمت سرانجام دی۔ ان کے سلسلے کو سلسلہ قلندریہ کہتے ہیں۔

**پاکستان۔ اسلامی معاشرے کی تشکیل کی طرف ایک قدم:** ان حقائق سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے جنوبی ایشیا میں زندگی کے ہر میدان میں نمایاں ترقی ہوئی۔ انھوں

نے قدیم سیاست اور معاشرے کو بدل کر رکھ دیا اور عدل و انصاف پر مبنی نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔ مسلمانوں کے زوال پر 1857ء میں انگریزوں نے جنوبی ایشیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا جس کے نتیجے میں مغربی تہذیب و اقدار کے اثرات پھیلنے لگے۔ بالآخر جب حالات نے انگریزوں کو بھی اپنی بساطِ سیاست لپیٹنے پر مجبور کیا تو ذہنوں میں سوال پیدا ہوا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد جنوبی ایشیا میں نیا نظام کیا ہوگا۔ مسلمانوں نے اپنے دور میں اس قدر رواداری سے کام لیا تھا کہ سینکڑوں سال کی حکومت کے باوجود مسلمان اب بھی اقلیت میں تھے اور خطرہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے خاطر خواہ دور اندیشی اور سوجھ بوجھ سے کام نہ لیا تو نئے مغربی جمہوری نظام میں وہ ہندوؤں کے محکوم بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے نازک مرحلے پر پاکستان کے قیام کا فیصلہ در حقیقت جنوبی ایشیا کے ایک حصے میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کی طرف ایک قدم تھا جس میں مندرجہ ذیل مقاصد کار فرما تھے :

(1) مسلمان طبعاً حریت پسند ہیں وہ کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے۔ انگریزوں کے اقتدار میں بھی وہ حصول آزادی کی مسلسل کوشش کرتے رہے اور ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ ہندوؤں کی غلامی قبول کر لیتے۔ قائداعظم نے اسی نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے مسلم لیگ کونسل کے فروری 1940ء کے اجلاس سے خطاب کیا اور فرمایا "ہم نہ برطانیہ کو اپنے اوپر اقتدار قائم کرنے دیں گے اور نہ ہی مسٹر گاندھی اور کانگرس کو۔ ہم دونوں کے اثر سے آزاد رہنا چاہتے ہیں"۔

(2) اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں اسلامی ریاست کے تمام رہنما اصول موجود ہیں۔ مسلمانوں کی دلی خواہش تھی کہ صحیح اسلامی معاشرے کو دوبارہ قائم کریں جس میں عدل، جمہوری مساوات اور سماجی بہبود کی خوبیاں موجود ہوں۔

(3) مسلمانوں کو اپنی بلند پایہ تہذیب و ثقافت پر ہمیشہ ناز رہا ہے۔ ہندو قوم اس تہذیب کو مٹا دینے کے درپے تھی۔ قیام پاکستان کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ اعلیٰ اسلامی اقدار اور تہذیبی و ثقافتی علامات کو بچایا جائے۔

(4) جنوبی ایشیا میں مسلمانوں نے صدیوں حکومت کی تھی چنانچہ وہ نہایت خوش حال قوم تھے۔ انگریزوں کے دور حکومت میں ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت سے مسلمان اس علاقے کی نہایت مفلس و بدحال قوم بن گئے۔ سندھ، سرحد اور بلوچستان جیسے مسلم اکثریت کے صوبوں کی

ترقی کو خاص طور پر نظر انداز کیا گیا۔ پاکستان قائم کر کے جنوبی ایشیا کے مسلمان کو ہندو کے استحصال سے نجات دلانا بھی مقصود تھا تاکہ تمام صوبوں کے مسلمان آزاد اور پر امن فضا میں خوش حالی کی راہ پر گامزن ہو سکیں۔

(5) پاکستان میں صحیح اسلامی معاشرہ قائم کر کے مسلمان جدید دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ دوسری اقوام اس سے متاثر ہو کر اس کی تقلید کر سکیں۔ ان کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ پاکستان کو عالم اسلام کا قلعہ اور مرکز بنا دیا جائے اور یہ مرکز مسلم ممالک کے مسائل حل کرنے میں مدد دے۔

## نظریہ پاکستان

ہر انسان کے سامنے اپنی زندگی کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس مقصد کے بغیر انسان کی زندگی بے معنی ہو جاتی ہے۔ جب کوئی خاص مقصد بہت سے لوگوں کی زندگی کا مشترکہ نصب العین بن جائے تو وہ ان کا مشترکہ نظریہ حیات کہلاتا ہے۔ کسی بھی انقلابی تحریک کے پیچھے کوئی نہ کوئی نظریہ کارفرما ہوتا ہے اور کسی بھی قوم کی اجتماعی زندگی میں نظریے کی حیثیت روح کی ہوتی ہے۔ سیاسی، معاشرتی اور معاشی پہلو مل کر نظام زندگی ترتیب دیتے ہیں اور ان سب دائروں میں حقوق اور رشتوں کا تعین نظام زندگی کا تانا بانا ہے۔ یہ سب باتیں ایک نظریے کے تحت طے پاتی ہیں، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نظریے سے زندگی کا نظام بنتا ہے اور ترقی کی جہت متعین ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو اپنی انفرادی اور اجتماعی ہر دو زندگیوں میں ساری ہدایت و رہنمائی اپنے دین سے ملتی ہے۔ اسلام انسانوں کے مابین تعلقات و حقوق بھی معین کرتا ہے اور ریاست و معاشرے کو بھی منظم کرتا ہے۔ ہر معاملے میں اصل معیار اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا عمل یعنی قرآن و سنت ہوتا ہے۔ مسلم قوم کا یہی نظریہ حیات، تحریک پاکستان کی اساس بنا۔ پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا ہے اور یہ نظریہ مسلمانوں کا دین اسلام ہے۔ یہی نظریہ پاکستان کا مفہوم ہے۔ گویا یہاں سیاسی، معاشی، معاشرتی غرضیکہ پوری زندگی کا نظام اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ہو گا اور ہر معاملے میں رہنمائی قرآن اور سنت رسول اللہ، صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم سے حاصل کی جائے گی۔

# قائداعظم اور نظریہ پاکستان

قائداعظم نے مختلف مواقع پر اپنی تقاریر میں نظریہ پاکستان کی کھل کر وضاحت کی۔ 23 / مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے ستائیسویں تاریخ ساز اجلاس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے دو قومی نظریے کو بڑے مؤثر اور خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ آپ نے فرمایا:

"اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب نہیں ہیں بلکہ در حقیقت وہ دو مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ چنانچہ اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہیے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ میں واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے واسطہ رکھتے ہیں اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں"۔

قائداعظم نے پر زور الفاظ میں واضح کیا کہ مسلمان جنوبی ایشیا میں ایک اقلیت نہیں بلکہ ایک الگ قوم ہیں جس کے لیے الگ وطن از بس ضروری ہے۔ مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کراچی 1943ء کے موقع پر قائداعظم نے قرآن پاک کی طرف رجوع کرنے کی اہمیت کی ان الفاظ میں وضاحت فرمائی:

"وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن مجید ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا"۔

قیام پاکستان کے اصل مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے اسلامیہ کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ

ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا ہمارا مقصود تھا جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں"۔

اسی طرح اکتوبر 1947ء میں حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب کے موقع پر اسی خیال کی یوں وضاحت فرمائی:

"ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں' جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصور کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے"۔

## صوبوں میں جدوجہد آزادی

جب سے انگریزوں نے جنوبی ایشیا پر قبضہ کیا تھا' مسلمان کسی نہ کسی صورت میں آزادی کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ انھوں نے مسلح کوششیں بھی کیں اور آئینی ذرائع بھی استعمال کیے۔ مختلف صوبوں نے جدوجہد آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کا ذکر ضروری ہے کیونکہ یہی وہ ندیاں تھیں جو مرکزی تحریک کے عظیم دریا میں شامل ہو کر قوت و عظمت عطا کرتی رہیں۔

**شمال مغربی سرحدی صوبہ:** صوبہ سرحد کے غیور مسلمانوں نے جنوبی ایشیا کی تمام ملی و ملکی تحریکوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ انگریزوں نے صوبہ سرحد کو "سرزمین بے آئین" بنا رکھا تھا۔ قائداعظم نے 1927ء میں صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا چنانچہ یہاں سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ جب 1940ء میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی تو سرحد کی طرف سے سردار اورنگ زیب خان نے اس کی مؤثر انداز میں تائید کی۔ تاہم 1945ء تک مسلم لیگ سرحد میں پوری طرح منظم نہ تھی۔ کانگرس نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور قیام پاکستان کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا۔ 1945ء میں قائداعظم کی کوشش سے مسلم لیگ فعال ہوئی۔ اب یہاں کی کانگرسی حکومت نے مسلم لیگ کے رضا کاروں اور رہنماؤں پر مظالم شروع کیے۔ انھیں جھوٹے مقدموں میں ملوث کر کے جیل بھیجا جانے لگا۔ قریباً" آٹھ ہزار کارکن نظر بند کر دیے گئے مگر مسلم لیگ کی تحریک زور شور سے جاری رہی۔ ایک خفیہ قلمی روز نامہ "صدائے پاکستان"

اور ایک خفیہ ریڈیو سٹیشن بھی شروع کیا گیا۔ جس سے تحریک کو رہنمائی ملتی تھی۔

جدوجہد آزادی کے سلسلے میں سرحد کے مشائخ کی خدمات قابلِ قدر ہیں۔ انھوں نے پورے صوبے میں جوش و خروش پھیلا دیا اور عوام میں قیام پاکستان کے تصور کو ابھارا۔ اسلامیہ کالج پشاور اور ایڈورڈ کالج پشاور کے طلبہ بھی تحریک پاکستان میں پیش پیش رہے۔ سرحد کی خواتین نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

بلوچستان : انگریزوں نے بلوچستان کو ہمیشہ پس ماندہ رکھنے کی کوشش کی۔ 1927ء میں مسلم لیگ نے مطالبہ کیا کہ اس صوبے میں سیاسی اصلاحات نافذ کی جائیں مگر حکومت اس بات سے گریزاں رہی۔ جون 1939ء میں بلوچستان مسلم لیگ قائم ہوئی اور قاضی محمد عیسیٰ نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ لاہور میں انھوں نے ہی بلوچستان کی طرف سے قرارداد پاکستان کی حمایت کی۔ 23 مارچ 1941ء کو کوئٹہ میں ایک عظیم جلسہ عام منعقد کر کے یومِ پاکستان منایا گیا۔ دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں کانگرسی امیدوار کو شکست ہوئی جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بلوچستان کے عوام کو مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان سے وابستگی تھی۔ 1943ء میں بلوچستان مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم ہوئی۔

قیام پاکستان کے وقت فیصلہ کیا گیا تھا کہ بلوچستان کا شاہی جرگہ یہ طے کرے گا کہ آیا یہ صوبہ، پاکستان میں شامل ہو گا یا بھارت میں۔ اس موقع پر کانگرس نے سازشوں کا جال بچھایا مگر اس کی ایک نہ چلی کیونکہ قائدین بلوچستان نے اس ضمن میں بہت کام کیا تھا۔ شاہی جرگے میں ایجنٹ برائے گورنر جنرل نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اعلان پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اعلان ختم نہیں ہوا تھا کہ نواب محمد خان جوگیزائی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہم نے پاکستان کے حق میں فیصلہ کر لیا ہے اور سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

سندھ : جنوبی ایشیا میں سب سے پہلے اسلام سندھ میں آیا، اسی لیے اس صوبے کو "باب الاسلام" کہتے ہیں۔ اس مسلم اکثریتی صوبے کی اہمیت ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے اسے صوبہ بمبئی کا حصہ بنا رکھا تھا۔ بالآخر 1935ء کے ایکٹ کے مطابق مسلم لیگ کی زبردست کوشش کے نتیجے میں اسے بمبئی سے الگ کر کے مکمل صوبے کا درجہ دیا گیا۔ صوبوں میں مسلم لیگ کے ساتھ سب سے قدیم تعلق سندھ کا ہے۔ مسلم لیگ کا سب سے پہلا سالانہ اجلاس دسمبر 1907ء میں

کراچی کے مقام پر منعقد ہوا۔ اسی صوبے کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ سندھ مسلم لیگ نے 1938ء میں ایک قرارداد منظور کی جس میں پہلی بار یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں مسلم حکومت قائم کی جائے۔ یہی قررداد بالآخر قرارداد پاکستان کا پیش خیمہ بنی۔

1940ء میں قرارداد پاکستان کی حمایت میں سندھ کی طرف سے سر عبداللہ ہارون نے تقریر کی۔ بعد میں قائداعظم نے صوبے میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جس نے اس ضمن میں بڑا کام کیا، یہاں تک کہ 1943ء میں سندھ میں مسلم لیگ کی وزارت قائم ہو گئی جو جنوبی ایشیا میں پہلی مسلم لیگی وزارت تھی۔ 1943ء ہی میں سندھ اسمبلی میں مطالبہ پاکستان کی قرارداد پیش کی گئی جو فوراً منظور کر لی گئی۔ 1946–1945ء کے موسم سرما میں منعقدہ انتخابات میں مسلم لیگ نے صوبہ سندھ میں بھاری اکثریت حاصل کی اور وزارت بنائی۔ اس وزارت کو توڑنے کے لیے کانگرس نے بڑی سازشیں کیں جو سب ناکام رہیں۔

سندھ کی جدوجہد آزادی میں پیر صبغتہ اللہ شاہ پیر پگارا کی ہمت و شجاعت ہمیشہ یاد رہے گی۔ ان کے مرید "حر" کہلاتے ہیں۔ پیر صبغتہ اللہ شاہ نے انگریزوں کے سامنے سر اطاعت خم نہ کیا اور بالآخر دوسری جنگ عظیم کے دوران میں حروں نے مسلح جنگ آزادی شروع کر دی۔ انگریز حکومت کی افواج بڑی محنت اور نقصان کے بعد اسے دبانے میں کامیاب ہوئیں۔ پیر صاحب شہید کر دیے گئے اور ان کے بیٹوں کو انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس کے باوجود حروں کے جذبہ حریت میں فرق نہ آیا۔

سندھ میں مشائخ کا سرہندی خاندان حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آباء کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی میں نمایاں حصہ لیا اور قائداعظم کا بھرپور ساتھ دیا۔ سندھ کے مشائخ نے جمعیت المشائخ قائم کر کے مسلم لیگ کی حمایت کی۔ طلبہ میں سندھ مدرسہ کراچی کے طالب علم پیش پیش تھے اور سندھ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بڑی فعال تھی۔ صوبہ سندھ کی خواتین نے بھی جدوجہد آزادی کے لیے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ جلسے جلوس نکالے اور ہر خطرے کو پار کر کے قیام پاکستان کے تصور کو مزید اجاگر کیا۔

پنجاب : پنجاب آبادی اور وسائل کے اعتبار سے بڑا صوبہ تھا، مگر انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی

بھگت سے یہاں کے مسلمان استحصال کا شکار تھے۔ عظیم مفکر علامہ اقبال نے اپنے اشعار و افکار سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور انھیں اپنے اسلامی تشخّص کی بحالی کا سبق دیا۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے آزاد مسلم ریاست کا تصور پیش کیا۔ 23 رمارچ 1940ء کو لاہور میں وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔ اس کے بعد پورے صوبے میں مسلم لیگ نے زبردست مہم چلائی۔ 46-1945ء کے موسم سرما میں ہونے والے انتخابات میں پنجاب میں مرکزی اسمبلی کے لیے مسلم لیگ کو سو فی صد کامیابی ہوئی جب کہ صوبائی اسمبلی میں اسے قریباً 90 فی صد نشستیں ملیں۔

پنجاب کے علماء و مشائخ نے تحریک پاکستان میں نمایاں کردار ادا کیا اور اپنے اپنے حلقۂ اثر میں عوام کو جدوجہد آزادی کے لیے تیار کیا۔ پنجاب کے مسلم طلبہ بہت بیدار تھے۔ انھوں نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن منظم کی اور علامہ اقبال کے ارشاد پر 1937ء میں ہی اپنے آئین میں آزاد مسلم ریاست کا قیام شامل کر لیا۔ گویا قرارداد پاکستان منظور ہونے سے پہلے ہی وہ اس مقصد کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ 1941ء میں اسلامیہ کالج لاہور میں پاکستان کانفرنس منعقد کی گئی جس کی صدارت قائداعظم نے کی۔ یونینسٹ وزارت کے خلاف سول نافرمانی میں طلبہ پنجاب کے دیہات میں پھیل گئے اور حکومت کو ہلا کر رکھ دیا۔

پاکستان کی کوششوں کے سلسلے میں پنجاب کی خواتین کسی سے کم نہ تھیں۔ انھوں نے بیش قدر خدمات سرانجام دیں بلکہ بیشتر خواتین نے خود کو مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیا۔ سول نافرمانی کے دوران میں پنجاب ہی کی ایک نوجوان خاتون نے پنجاب سیکرٹریٹ سے انگریزوں کا جھنڈا یونین جیک اتار کر مسلم لیگ کا علم لہرا دیا۔

**مسلم اقلیتی صوبے:** مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان حصول پاکستان کی تحریک میں برابر کے شریک رہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اس جدوجہد میں ہراول دستے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب 1940ء میں قرارداد پاکستان پیش ہوئی تو سب سے پہلے اس کی تائید چودھری خلیق الزمان نے کی جو مسلم اقلیتی صوبے یو۔ پی کے نمائندہ تھے۔ بعد ازاں بہار، مدراس، بمبئی اور سی۔ پی کے نمائندوں نے اس کی پر زور حمایت کی۔ ان صوبوں کے مسلمان خوب جانتے تھے کہ ان کے علاقے پاکستان میں شامل نہیں ہوں گے اور انھیں بدستور ہندوؤں کے تحت مصائب

برداشت کرنا پڑیں گے مگر وہ خوش تھے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا قومی وطن بن رہا ہے اور ایک گوشہ ایسا ہو گا جہاں اسلامی معاشرہ قائم ہو سکے گا۔

1945-46ء کے انتخابات اس لیے بہت اہم تھے کہ وہ مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے تھے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کو مسلم اقلیتی صوبوں میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ بمبئی، اڑیسہ اور مدراس میں مسلم لیگ نے سو فی صد مسلم نشستیں حاصل کیں۔ ان واقعات سے مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے ایثار و جذبۂ قربانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان صوبوں کے علما و مشائخ بھی تحریک پاکستان میں شامل تھے۔ 1937ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو ان کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ 1946ء میں بنارس کے مقام پر علماء و مشائخ نے کانفرنس منعقد کی اور مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبہ نے آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی جس کا پہلا اجلاس 1937ء میں کلکتہ میں ہوا۔ ان طلبہ نے تحریک پاکستان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان صوبوں کی خواتین نے بھی دیگر صوبوں کی خواتین کی طرح قیام پاکستان کے لیے بھرپور کام کیا اور مسلم لیگ کی تنظیم نو میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

## حصول پاکستان کی جانب سفر

مسلم حکومت اٹھارھویں صدی تک اپنے عروج پر رہی مگر انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی پر جنوبی ایشیا میں مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ یہ دور مسلمانوں کے لیے مایوسیوں کا دور تھا۔ ان پر مظالم کی انتہا ہو گئی اور وہ معاشی طور پر تباہ حال ہو گئے۔ سرسید احمد خان نے تعلیم کے ذریعے انھیں دوبارہ ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے علی گڑھ کالج قائم کیا۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان ایک بار پھر سنبھل گئے۔

**مسلم لیگ کا قیام اور اس کے اغراض و مقاصد :** موجودہ صدی کے آغاز میں جنوبی ایشیا میں سیاسی بیداری ہو چکی تھی۔ مغربی تعلیم اور پریس کی ترقی نے غیر ملکی حکومت سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ 1885ء میں مسٹر اے۔ او۔ ہیوم نامی ایک انگریز نے کانگرس کی

بنیاد ڈال دی تھی۔ یہ سیاسی جماعت ہندوؤں کے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔ چنانچہ مسلم اکابرین نے اس امر کی ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفّظ کے لیے بھی ایک سیاسی جماعت کا ہونا ضروری ہے۔ مندرجہ ذیل واقعات نے اس ضرورت کا احساس اور زیادہ شدید کر دیا:

(i) ہندوؤں میں آریا سماج جیسی تحریکیں چل رہی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ایشیا میں مسلم تمدن کے تمام نقوش مٹا دیے جائیں۔ وہ اُردو زبان اور رسم الخط کے خلاف مہم چلا رہے تھے اور ان کی بجائے ہندی زبان اور دیو ناگری رسم الخط کو رائج کرنا چاہتے تھے۔

(ii) ہندو گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کرنا چاہتے تھے اور اس سوال پر کئی جگہ ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔

(iii) ہندو ادب بالخصوص بنگالی ادب میں مسلم تمدن پر گھٹیا انداز میں کیچڑ اچھالا گیا۔ ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا ہے۔ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں یا وہ ہندومت قبول کر لیں یا ملک سے ہجرت کر جائیں۔

(iv) بنگال کا صوبہ رقبے و آبادی کے لحاظ سے بہت بڑا تھا۔ 1905ء میں اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یوں مشرقی بنگال ایک بھاری اکثریت والا مسلم صوبہ بن گیا اور وہاں کے پسماندہ مسلمانوں کی ترقی کے امکانات روشن ہو گئے۔ ہندو اس صورت حال کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے تقسیم بنگال کے خلاف زبردست تحریک چلائی۔ اس واقعہ نے بھی مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔

(v) اسی زمانے میں حکومت برطانیہ نے جنوبی ایشیا میں آئینی اصلاحات نافذ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مسلم لیڈروں کو احساس ہوا کہ نئے آئین میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفّظ ہونا چاہیے، چنانچہ انھوں نے سر آغا خاں کی قیادت میں مسلمان زعما کا ایک وفد وائسرائے لارڈ منٹو کے پاس بھیجا۔ یہ وفد شملہ کے مقام پر وائسرائے سے ملا اور اس نے حکومت برطانیہ سے مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ ایسے مطالبات منوانے کے

لیے مسلمانوں کی ایک سیاسی جماعت قائم کی جائے۔

دسمبر 1906ء میں جنوبی ایشیا کے مسلمان اکابرین بڑی تعداد میں ڈھاکہ کے مقام پر جمع ہوئے اور نواب وقار الملک کی صدارت میں وہ تاریخی جلسہ منعقد ہوا جس میں "آل انڈیا مسلم لیگ" قائم ہوئی۔ سر آغا خاں کو اس کا پہلا صدر مقرر کیا گیا اور اس کا مرکزی دفتر علی گڑھ میں قائم کیا گیا۔

مسلم لیگ کے سامنے سب سے اہم مقصد برصغیر کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگہداشت اور ان کی ضروریات و خواہشات کو حکومت کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور ملک کی دوسری اقوام میں باہمی مفاہمت کی فضا پیدا کرنا نیز حکومت اور مسلمانوں کے مابین غلط فہمیوں کا ازالہ بھی اس کے مقاصد میں شامل تھے۔

مسلم لیگ کی سب سے پہلی بڑی کامیابی یہ تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1909ء (جسے منٹو مارلے اصلاحات کا نام دیا جاتا ہے) میں جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا۔ یعنی مسلمان اپنے حلقوں میں مسلم نمائندوں کا انتخاب کریں گے۔ اور ہندو اپنے حلقوں میں ہندو نمائندے چنیں گے۔ یہی اصول پاکستان کی بنیاد بنا۔

میثاق لکھنؤ 1916ء : بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسلم لیگ کی قیادت نوجوان طبقے کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ ان میں قائداعظم محمد علی جناح سب سے نمایاں تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ کانگرس اور مسلم لیگ مل کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ملک کے آئینی ڈھانچے پر اتفاق ہو جائے۔ چنانچہ قائداعظم کی کوشش سے 1916ء میں لکھنؤ کے مقام پر مسلم لیگ اور کانگرس کا سالانہ اجلاس ایک ساتھ ہوا اور دونوں میں معاہدہ کے تحت طے پایا کہ :

(i) کانگرس جداگانہ انتخاب کے طریق کو قبول کرلے گی۔

(ii) مرکزی اسمبلی میں مسلم نمائندوں کی تعداد منتخب اراکین کی مجموعی تعداد کا ایک تہائی ہو گی۔

(iii) مسلم اکثریت کے صوبوں بنگال اور پنجاب میں مسلم نمائندوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ کم لیکن مسلم اقلیتی صوبوں میں ان کے نمائندوں کی تعداد

ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہو گی۔

(iv) قانون سازی کے سلسلے میں کسی ایسی تجویز پر غور نہیں ہوگا' جس کی مخالفت اس قوم کے نمائندوں کی تین چوتھائی کرے۔

اس میثاق کی رو سے ہر صوبے میں مسلمان نمائندوں کی تعدد اتنی ہو گئی کہ اگر وہ کانگرس سے مل جاتے تو حکومت کو شکست ہو جاتی اور اگر حکومت سے مل جاتے تو کانگرس کو شکست ہو جاتی۔ اس سے ان کی اہمیت بڑھ گئی۔

**تحریک خلافت :** پہلی جنگ عظیم (18-1914ء) میں ترکی کو اتحادیوں (امریکہ اور اس کے ہمنوا) کے ہاتھوں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے اختتام پر اتحادیوں نے ترکی کی سلطنت کے حصے بخرے کرنا شروع کر دیے۔ اس پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی کیونکہ وہ ترکی کی سلطنت اور خلافت عثمانیہ کو اتحاد اسلامی کی علامت خیال کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک زبردست تحریک شروع کی جسے تحریک خلافت کہا جاتا ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ خلافت بحال رکھی جائے۔ سلطنت ترکیہ کی سالمیت کی ضمانت دی جائے۔ جب حکومت برطانیہ نے ان مطالبات پر توجہ نہ دی تو مسلمان مشتعل ہو گئے۔ انھوں نے عدم تعاون کا راستہ اختیار کیا۔ حکومت کے خطابات واپس کر دیے' سرکاری تقریبات' تعلیمی اداروں' عدالتوں اور غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جگہ جگہ جلسے منعقد ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ کئی مقامات پر پولیس سے جھڑپیں ہوئیں۔ مسلمان لیڈروں اور سیاسی کارکنوں کو قید میں ڈال دیا گیا۔

مسٹر گاندھی بھی تحریک عدم تعاون میں پیش پیش تھے مگر جب یہ تحریک اپنے عروج پر تھی تو مسٹر گاندھی نے مسلمان زعما سے مشورہ کیے بغیر اچانک تحریک کے خاتمے کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے مقاصد کو نقصان پہنچا۔ دریں اثنا خود کمال اتاترک نے بھی ترکی میں خلافت کا خاتمہ کر دیا تھا۔

تحریک خلافت ایک زبردست عوامی تحریک تھی۔ مسلمانوں نے بڑے ایثار سے ہر قسم کے نقصانات برداشت کیے۔ اس تحریک نے مسلم عوام میں وہ سیاسی بیداری پیدا کی جس نے بعد میں تحریک پاکستان میں نشان راہ کا کام دیا۔ مسلمانانِ جنوبی ایشیا پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ کانگرس اور

ہندو مسلمانوں کے مفادات کا پاس نہیں کر سکتے۔

**ہندو مسلم فسادات اور نہرو رپورٹ:** تحریک خلافت کے دوران میں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب آ گئے، مگر یہ ہندو، مسلم اتحاد عارضی ثابت ہوا اور تحریک خلافت کے خاتمے کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ دونوں قوموں کے اختلافات نے اس قدر شدت اختیار کی کہ ملک میں خونریز اور فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔ رہی سہی کسر نہرو رپورٹ نے پوری کر دی۔ موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تاکہ جنوبی ایشیا کے لیے ایسا آئینی ڈھانچہ تیار کیا جائے جو سب اقوام کے لیے قابل قبول ہو۔ جب 1928ء میں اس کمیٹی کی رپورٹ سامنے آئی تو مسلمان ہکا بکا رہ گئے کیونکہ اس رپورٹ میں ہندو اس معاہدہ سے بھی پھر گئے جو انھوں نے میثاق لکھنؤ کی صورت میں کیا تھا۔ جداگانہ انتخاب کا اصول ختم کر دیا گیا اور مسلمانوں کے تمام تحفّظات نظر انداز کر دیے گئے۔ نہرو رپورٹ سے عیاں ہو جاتا ہے کہ کانگرس اور ہندو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے مفادات کا مناسب تحفّظ نہ کرتے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے مفادات کے منافی اقدام کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس احساس نے مسلمانوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔

**چودہ نکات:** مارچ 1929ء میں قائداعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنے مشہور چودہ نکات پیش کیے اور واضح کیا کہ جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں، مسلمانوں کے لیے کوئی آئین قابل قبول نہیں ہوگا:

1- ملک کا آئین وفاقی طرز کا ہو۔

2- صوبوں کو خود اختیاری دی جائے۔

3- ہر صوبے میں اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

4- مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

5- جداگانہ انتخاب کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

6- صوبوں کی کوئی نئی حد بندی بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد میں مسلم اکثریت کو متاثر نہ کرے۔

7- تمام فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔

8- مجلس قانون ساز میں کوئی ایسا قانون منظور نہ ہو جس کی مخالفت اس فرقے کے

نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد کرے۔

9- سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

10- باقی صوبوں کی طرح سرحد اور بلوچستان میں بھی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

11- تمام ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے۔

12- آئین میں مسلم تمدن، تعلیم، زبان، مذہب، شرعی قوانین اور خیراتی اداروں کو تحفظ دیا جائے۔

13- مرکز اور صوبوں میں کوئی ایسی وزارت قائم نہ کی جائے جس میں مسلم وزرا کل تعداد کا ایک تہائی نہ ہوں۔

14- صوبوں کی مرضی کے بغیر مرکزی اسمبلی آئین میں تبدیلی کرنے کی مجاز نہ ہو۔

اپنے ان چودہ نکات کے ذریعے قائداعظم نے مسلمانوں کے نقطہ نظر کو سب پر واضح کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی سوچ و عمل کے دھارے میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی جو جنوبی ایشیا کے سیاسی افق پر بعد میں رونما ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

**خطبہ الہ آباد:** دسمبر 1930ء میں الہ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت علامہ اقبالؒ نے کی جو اس وقت تک ایک مفکر اور مسلمان رہنما کی حیثیت سے اپنا مقام حاصل کر چکے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے صدارتی خطبے میں مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے نظریے پر تفصیلاً روشنی ڈالی اور اسلام کے سیاسی تصورات کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ مسلمان اپنے دین کامل اور اسلامی ثقافتی ورثے کی بدولت دیگر اقوام سے مختلف ہیں۔ آپ کے اس خطبہ صدارت کو برصغیر کے سیاسی افق کے حوالے سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے---- شمال مغربی برصغیر میں مسلم ریاست کا قیام مسلمانوں کا مقدر بن چکا ہے"۔

علامہ اقبال کا یہ خطبہ مسلمانوں کے لیے روشنی کا ایسا مینار ثابت ہوا جس نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور ایسی منزل کی نشاندہی کی جس کے بغیر ان کے مسائل کا حل ممکن نہ تھا۔

**گول میز کانفرنسیں:** ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین اپنے تیئں آئندہ آئین کے متعلق اتفاق

نہیں ہو سکا تھا' اس لیے حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ جنوبی ایشیا میں آباد اہم قوموں کے نمائندوں پر مشتمل گول میز کانفرنس لندن میں منعقد کی جائے تاکہ باہمی گفت و شنید سے اختلافی مسائل طے ہو سکیں -1930ء اور 1932ء کے درمیان ایسی تین کانفرنسیں منعقد ہوئیں لیکن وہ کسی متفقہ فیصلے پر نہ پہنچ سکیں۔ پہلی کانفرنس میں کانگرس نے شرکت سے انکار کر دیا۔ دوسری کانفرنس میں مسٹر گاندھی نے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی لیکن انھوں نے مسلمانوں کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح یہ کانفرنس بھی ناکام رہی۔ کانگرس کی اس ہٹ دھرمی سے مسلمان اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اس مرحلہ پر مسلمانوں پر مزید واضح ہو گیا کہ ہندو اور ان کی جماعت کانگرس کسی صورت بھی کوئی ایسا فارمولا اپنانے کو تیار نہیں' جس سے مسلمانوں کے حقوق کا تحفّظ ممکن ہو سکے' یہی وجہ ہے کہ گول میز کانفرنسوں کے بعد کی مسلم سوچ اور سیاست میں ایک واضح تبدیلی پیدا ہوئی' جو بالآخر قرارداد پاکستان کو منظور کرنے اور بعد ازاں قیام پاکستان پر منتج ہوئی۔

**قانون 1935ء اور کانگرسی وزارتیں:** طویل عرصہ کی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر حکومت نے قانون مجریہ 1935ء منظور کر لیا جس کی رو سے مرکز میں دو عملی نظام قائم کرنے کی تجویز تھی۔ صوبوں کو خود اختیاری دے دی گئی اور صوبائی محکمے وزرا کے سپرد کر دیے گئے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر قابل اطمینان تھا کہ ان کی زبردست مہم کے نتیجے میں اب سندھ کو صوبہ بمبئی سے الگ کر کے مکمل صوبے کا درجہ دے دیا گیا تھا' نیز سرحد میں دیگر صوبوں کی طرح سیاسی اصلاحات نافذ کر دی گئی تھیں۔

قانون 1935ء کا وہ حصہ جو مرکز سے متعلق تھا' عملی جامہ نہ پہن سکا' البتہ صوبائی حصے کا نفاذ عمل میں آیا اور 1937ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے۔ ابھی تک مسلم لیگ اس کوشش میں تھی کہ برصغیر کے عظیم تر مفاد کے پیش نظر کانگرس کے ساتھ سمجھوتہ ہو جائے' چنانچہ اس انتخابات میں بھی مسلم لیگ نے کانگرس سے اشتراک کیا۔

انتخابات کے بعد کانگرس نے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں وزارتیں قائم کر لیں۔ مسلم لیگ کو بجا طور پر توقع تھی کہ کانگرس اسے بھی وزارت میں شریک کرے گی مگر کامیابی کے بعد کانگرس کی مخصوص ہندو ذہنیت آشکار ہو گئی۔ اس نے کہا کہ صرف اسی صورت

میں مسلم لیگ کو حکومت میں شریک کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی الگ جماعتی حیثیت ختم کر دے اور کانگرس میں مدغم ہو جائے۔ کانگرس کی ہوس اقتدار کا یہ عالم تھا کہ جہاں اسے اکثریت حاصل تھی، وہاں کسی کو ساتھ ملانے کے لیے تیار نہ تھی، لیکن جہاں اس کی تعداد زیادہ نہ تھی، وہاں اس نے دوسری جماعتوں سے مل کر وزارت قائم کی۔ یہ دوسری صورت صوبہ سرحد اور آسام میں پیش آئی۔

کانگرس اقتدار کے نشے میں چور تھی۔ اس نے ایسے اقدامات شروع کیے جن سے مسلمانوں کو سخت ٹھیس پہنچی۔ اس نے بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا حالانکہ یہ گیت ایک ایسی کتاب سے ماخوذ تھا جو سراسر مسلم دشمنی پر مبنی تھی۔ یو۔ پی میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں بہتر مقام حاصل تھا۔ کانگرسی حکومت اسے ختم کرنے کے درپے ہو گئی اور مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے بند کیے جانے لگے۔ کانگرس کے کارکن ہر جگہ نظم و نسق میں مداخلت کرنے لگے اور ان کے زیر اثر تھانوں و عدالتوں میں ظلم و ستم شروع ہوا۔ اُردو کو ختم کر کے ہندی کو فروغ دیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ سی۔ پی میں جو تعلیمی منصوبہ نافذ ہوا، اس کا نام ہی "ودیا مندر" رکھا گیا۔ سکولوں میں مسلمان بچوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بندے ماترم گائیں اور مسٹر گاندھی کی تصویر کی پوجا کریں۔

کانگرس کے اس متکبّرانہ اور متعصبانہ طرز عمل نے مسلمانوں کو اس سے مکمل طور پر مایوس کر دیا۔ ہندو راج کے اس تلخ تجربے نے مسلمانوں کو متحد کر دیا۔ یوں وہ ان کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا۔ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے اور یہ جماعت دیکھتے ہی دیکھتے زبردست عوامی تحریک بن گئی۔ قائداعظم کی مقبولیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اس سیاسی فضا میں سندھ مسلم لیگ نے 1938ء میں وہ قرار داد منظور کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں مسلم حکومت قائم کی جائے۔ گویا اب مسلمانوں نے محض آئینی تحفّظات حاصل کرنے کی بجائے آزاد مملکت کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر جب کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو مسلم لیگ نے سارے ملک میں دسمبر 1939ء کو یوم نجات منایا۔

# مسلم لیگ کی عوامی تحریک اور قیام پاکستان

**قرارداد پاکستان 1940ء :** مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 1939ء میں اپنے اجلاس میرٹھ کے دوران ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ مختلف آئینی تجاویز پر غور کرے۔ اس کمیٹی کے صدر قائداعظم تھے۔ کمیٹی نے کافی غور کے بعد بالآخر 23 رمارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس لاہور میں وہ مشہور و معروف قرارداد پیش کی جسے قرارداد لاہور یا قرارداد پاکستان کہا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ یہ تھے :

"اس ملک میں کوئی دستوری خاکہ قابل عمل یا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل اصولوں پر مرتب نہ کیا جائے' یعنی جغرافیائی اعتبار سے متصلہ علاقے الگ خطے بنا دیے جائیں اور جو علاقائی ترمیمیں ضروری سمجھی جائیں کر لی جائیں تاکہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں جن علاقوں کے اندر مسلمانوں کو از روئے آبادی اکثریت حاصل ہے' وہ یکجا ہو کر ایسی آزاد ریاستیں بن جائیں' جن کے اجزائے ترکیبی خود مختار اور مقتدر ہوں"۔

اس قرارداد کا منظور ہونا تھا کہ کانگری حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہندو پریس میں اس کے خلاف شدید رد عمل ہوا۔ دوسری طرف مسلم لیگ کی حکمت عملی میں اب کوئی ابہام باقی نہ رہا۔ اس کا لائحہ عمل بالکل صاف تھا یعنی یہ کہ تمام مسائل کا واحد حل برصغیر کی تقسیم ہے۔ آزاد مسلم ریاست کا تصور عوام کے لیے اس قدر خوش آئند تھا کہ ان میں جوش و خروش کی انتہا نہ رہی اور اتحاد و تنظیم کے جذبات کی فراوانی پیدا ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں یہ خواب ایک حقیقت بن گیا۔

**کرپس کی تجاویز 1942ء :** جنگ عظیم دوم کے ابتدائی مراحل میں برطانیہ کو کئی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا' یہاں تک کہ جاپانی افواج برما میں پہنچ گئیں۔ اس پر حکومت برطانیہ نے جنوبی ایشیا کے باشندوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سر سٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز کے ساتھ یہاں بھیجا۔ ان میں کہا گیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر جنوبی ایشیا کو آزادی دے دی جائے گی۔ تمام آئین وفاقی طرز

کا ہوگا جس میں اقلیتوں کے حقوق کی نگہداشت کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ چاہیں تو الگ وفاق بنا لیں۔ حکومت ملک کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو فوری طور پر امور سلطنت میں شامل کرنے کو تیار تھی۔

کانگرس ان تجاویز سے اس لیے ناخوش تھی کہ ان میں صوبوں کو الگ وفاق بنانے کا اختیار دے کر قیام پاکستان کا امکان پیدا کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ وہ حکومت میں اپنے علاوہ دوسری جماعتوں کے نمائندوں کی شمولیت بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ مسلم لیگ کے نقطۂ نگاہ سے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ قیام پاکستان کا امکان پیدا ہو گیا تھا مگر وہ اس لیے ناخوش تھی کہ پاکستان کو واضح طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ بہرحال کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اپنی اپنی وجوہ کی بنا پر تجاویز کو مسترد کر دیا۔

**ہندوستان چھوڑ دو تحریک اور گاندھی جناح مذاکرات:** کرپس کی واپسی پر کانگرس نے حکومت کے خلاف بغاوت کا پروگرام بنایا اور اسے "ہندوستان چھوڑ دو تحریک" کا نام دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت دباؤ میں آکر کانگرس کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور مسلم لیگ کی پروا کیے بغیر اقتدار اس کے حوالے کر دے۔ اس تحریک سے عام بغاوت پھیلی۔ ریل کی پٹڑیاں اکھاڑی گئیں، تار کاٹے گئے اور سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ تاہم حکومت نے کانگرسی لیڈروں کو قید کر دیا اور بغاوت کچل دی۔ اس تحریک میں مسلم لیگ نے کانگرس کا ساتھ نہ دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ کوئی تحریک اس وقت تک کامیاب نہ ہوگی جب تک مسلمان اس میں شامل نہ ہوں۔

1944ء میں مسٹر گاندھی جیل سے رہا ہوئے تو انھوں نے قائداعظمؒ سے مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا مگر ان مذاکرات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، اس لیے کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔

**شملہ کانفرنس اور انتخابات:** 1945ء میں جنگ کی صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ برطانیہ کو اپنی فتح کا یقین ہو گیا تھا، چنانچہ وائسرائے لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ وائسرائے کی انتظامی کونسل تمام تر ہندوستانی اراکین پر مشتمل ہو گی اور اس میں تمام سیاسی جماعتوں کے نمائندے اس تناسب سے شامل ہوں گے کہ مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تعداد برابر ہو گی۔

ان تجاویز پر غور کرنے کے لیے جون 1945ء میں شملہ کے مقام پر کانفرنس منعقد ہوئی۔ کونسل میں پانچ مسلم اراکین شامل کرنے کی تجویز تھی۔ کانگرس کا اصرار تھا کہ ان میں سے کم از کم ایک مسلم نمائندہ وہ نامزد کرے گی۔ مگر قائداعظم نے واضح کر دیا کہ پانچوں مسلم ارکان کو صرف مسلم لیگ نامزد کر سکتی ہے کیونکہ وہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس نکتہ پر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

شملہ کانفرنس میں یہ فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ آیا مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے یا نہیں' چنانچہ اس کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا گیا۔ 46-1945ء کے موسم سرما میں عام انتخابات منعقد کرائے گئے۔ ان میں مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام کی تمام تیس مسلم نشستیں حاصل کر لیں جبکہ صوبوں میں قریباً 90 فی صد مسلم نشستیں حاصل کیں۔ یوں اس کا یہ دعویٰ ثابت ہو گیا کہ وہی مسلمانوں کی اصل نمائندہ جماعت ہے اور کسی بھی سیاسی تصفیے میں اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

**قرارداد 1946ء:** اپریل 1946ء میں قائداعظم نے مرکز اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام مسلم لیگی ارکان کا ایک کونشن دہلی میں بلایا۔ اس میں حسین شہید سہروردی نے ایک قرارداد پیش کی جس کی رو سے شمال مغرب اور شمال مشرق کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک آزاد مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا گیا۔

**کابینہ مشن منصوبہ:** 1945ء میں انگلستان میں لیبر پارٹی کی حکومت برسر اقتدار آئی تو اس نے مارچ 1946ء میں اپنی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک مشن جنوبی ایشیا روانہ کیا۔ اس مشن نے کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کی مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ اس پر اس نے 16 مئی 1946ء کو اپنی طرف سے ایک منصوبے کا اعلان کیا جس کے نمایاں پہلو یہ تھے:

(i) برصغیر کی یونین قائم کی جائے گی جو امور خارجہ' دفاع اور رسل و رسائل کی ذمہ دار ہو گی۔

(ii) مذکورہ مرکزی شعبوں کے علاوہ تمام شعبے صوبوں کے سپرد ہوں گے۔

(iii) صوبوں کو اختیار ہو گا کہ وہ باہم گروپ بنا لیں اور ہر گروپ اپنا دستور مرتب کرے۔

(iv) ہر دس سال کے بعد صوبوں کو اختیار ہوگا کہ وہ کثرت رائے سے آئین میں تبدیلی کا مطالبہ کر سکیں۔

جنوبی ایشیا کو تین گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ گروپ الف میں یو۔ پی' بہار' اڑیسہ سی۔ پی بمبئی اور مدراس تھے' گروپ ب میں پنجاب' سندھ اور سرحد گروپ ج میں بنگال اور آسام کے صوبے شامل تھے۔ اس طرح یہ سہ گانہ وفاق کا ایک انوکھا منصوبہ تھا۔

**عبوری حکومت :** کابینہ مشن میں یہ بات شامل تھی کہ جو جماعت اسے تسلیم کرے گی' اسے حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی' مگر برطانیہ کی لیبر حکومت کانگرس کی طرف واضح جھکاؤ رکھتی تھی اور اسے ہر حالت میں خوش رکھنا چاہتی تھی' اس لیے اس نے سازش کے تحت مسلم لیگ کو حکومت سے الگ رکھا اور کانگرس نے عبوری حکومت بنا لی۔ اس بد عہدی پر ملک میں بے چینی پھیل گئی اور ہنگامہ آرائی اور فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے۔

اب وائسرائے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے مسلم لیگ سے حکومت میں شمولیت کی درخوست کی۔ یہ حکومت چودہ وزرا پر مشتمل تھی۔ چھے کانگرس کے' پانچ مسلم لیگ کے اور تین وائسرائے کے نامزد تھے' مگر اس حکومت کے اندر اتنے شدید اختلافات تھے کہ عبوری حکومت ناکام ہو گئی۔

**ماؤنٹ بیٹن کی آمد اور برصغیر کی تقسیم :** مارچ 1947ء میں لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آیا۔ اس کا رویہ شروع سے کانگرس کے حق میں دوستانہ اور مسلم لیگ کے بارے میں غیر دوستانہ تھا۔ تاہم ہندو اور مسلمان زعما سے بات چیت کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ ملک کی تقسیم کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہیں۔ چنانچہ اس نے 3 جون 1947ء کو اپنے منصوبے کا اعلان کیا۔ اس کی رو سے طے پایا کہ برصغیر کو دو الگ الگ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے گا جنھیں شروع میں نو آبادیاتی حیثیت حاصل ہو گی' پنجاب اور بنگال کو دو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس کام کے لیے دو حد بندی کمیشن قائم کیے جائیں گے۔ سرحد اور سلہٹ میں استصواب کرایا جائے گا۔ سندھ اور آسام کی اسمبلیاں اپنے صوبوں کے مستقبل کا فیصلہ کریں گی۔ ریاستیں جس ملک میں چاہیں شامل ہو سکتی ہیں :

اس منصوبے کو کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے بادل نخواستہ قبول کیا۔ یوں آخر

کار 14 راگست 1947ء کو ایک صبر آزما سیاسی جدوجہد، یقین محکم اور عمل پیہم سے دنیا کی عظیم مسلم مملکت پاکستان عالم وجود میں آئی۔

## سوالات

(الف)

1- اسلام سے پہلے جنوبی ایشیا کی سماجی حالت مختصراً بیان کیجیے۔ اس میں ذات پات کا نظام کس طرح معاشرتی ناہمواری پیدا کرتا تھا؟

2- اسلام جنوبی ایشیا کے رہنے والوں پر سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور مذہبی لحاظ سے کس طرح اثر انداز ہوا؟

3- نظریہ پاکستان سے کیا مراد ہے؟ تاریخی اعتبار سے اس کا جائزہ لیجیے۔

4- قائداعظم کے فرامین کی روشنی میں نظریہ پاکستان کی وضاحت کیجیے۔

5- مندرجہ ذیل علاقوں میں جدوجہد آزادی کا اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، سندھ، پنجاب، مسلم اقلیتی صوبے۔

6- 1940ء سے قیام پاکستان تک کے واقعات نظریہ پاکستان کے تاریخی سفر کی ایک اہم کڑی تھے، وضاحت کیجیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کا ہاں یا نہیں میں جواب دیجیے:

1- اسلام سے پہلے جنوبی ایشیا کے معاشرے میں برہمن ملک و قوم کے دفاع اور امن و امان کے ذمہ دار تھے۔

2- جنوبی ایشیا میں قبل از اسلام معاشرے میں عورت کو بلند مقام حاصل تھا۔

3- مسلمانوں نے جنوبی ایشیا میں اعلیٰ نظام حکومت کی بنیاد ڈالی۔

4- مسلمانوں کی جنوبی ایشیا میں آمد سے پہلے ہندو، لباس کے معاملے میں سلیقہ مند نہ تھے۔

5- جنوبی ایشیا میں مسلم سلاطین کے زیر سایہ علم و ادب نے بڑی ترقی کی۔

6- سلسلہ نقشبندی کے بزرگوں کا مرکز اچ شریف تھا۔

7- سندھ کو ("باب الاسلام") کہتے ہیں۔

8- قرارداد پاکستان 23 رمارچ 1940ء کو پیش کی گئی۔

(ج) خالی جگہ پر کیجیے:

1- جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جو نیا آرٹ پیدا ہوا اسے------ کہتے ہیں۔ (اسلامک آرٹ، گندھارا آرٹ، انڈو اسلامک آرٹ)۔

2- قائداعظم نے----- میں صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ پیش کیا۔ (1934ء، 1927ء، 1913ء)

3- مسلم لیگ----- میں قائم کی گئی۔ (1905ء 1906ء، 1911ء)

4- علامہ اقبال کے------ نے مسلمانوں کو نئی راہ دکھائی اور اس پر گامزن ہو کر قیام پاکستان عمل میں آیا۔ (خطبہ آلہ آباد، خطبات مدراس)۔

5- _____ میں قرارداد لاہور پیش کی گئی۔ (1935ء، 1940ء، 1946ء)

6- 1945ء میں انگلستان میں----- برسراقتدار آئی تو اس نے اپنی کابینہ کے تین ارکان پر مشتمل ایک مشن جنوبی ایشیا روانہ کیا۔ (لیبر پارٹی، کنزرویٹو پارٹی، لبرل پارٹی)۔

7- 3 رجون 1947ء کو----- نے برصغیر کو دو الگ الگ مملکتوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا۔ (ماؤنٹ بیٹن، کرپس، سائمن)

2

# تاریخِ پاکستان

دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کا قیام بیسویں صدی کا ایک نہایت اہم اور عظیم واقعہ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح کا بلاشبہ یہ غیر فانی کارنامہ ہے کہ انھوں نے دنیا کے کسی بھی حصّے میں بسنے والے مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد کو منظم و متحد کر کے ایک قوم کی تشکیل دی اور ایک علیٰحدہ آزاد مملکت قائم کی جس میں اسلامی اقدار کی ترویج کے لیے ایک مشن کا آغاز کیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم (1939 تا 1945ء) نے انگریزوں کے عالمی اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔ برطانوی ہندوستان کے عوام میں آزاد و خود مختار ہونے کا عزم بھی روز بروز بڑھتا جا رہا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بالآخر انگریز برطانوی ہند کو آزادی دینے کے بعد اسے چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ برطانوی عہد میں مسلمانانِ برصغیر کی سیاست کا نمایاں پہلو یہ رہا کہ انھوں نے اپنی الگ سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت بر قرار رکھنے کے لیے جدوجہد جاری رکھی۔ اس سلسلے میں جن زعما نے خاص طور پر خدمات سرانجام دیں ان میں سرسید احمد خاں نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، سید امیر علی، سر آغا خاں سوم، چودھری رحمت علی، علامہ اقبال اور قائداعظم کے نام ہمیشہ تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جائیں گے۔ برطانوی ہند میں انگریزوں نے جمہوریت کے نام پر حکومت کے جو اصول وضع کر رکھے تھے وہ ہندو اکثریت کے لیے تو نہایت ساز گار تھے، مگر مسلمانوں کو ان سے قطعاً کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس مغربی جمہوریت،

کے نفاذ کا مطلب یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمان، ہندو اکثریت کے ابدی غلام بن کر رہ جائیں، مگر مسلمان جنھوں نے اسی برصغیر پر ساڑھے چھے سو سال تک شان و شوکت سے حکومت کی تھی، اس صورت حال کو قبول کرنے کے لیے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔

23 رمارچ 1940ء کو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں قرارداد لاہور متفقہ طور پر منظور ہوئی جو بعد میں قراردادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانانِ ہند کو اس وقت تک برصغیر کا کوئی سیاسی حل قابل قبول نہیں ہو گا جب تک کہ ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلم اکثریت والے جغرافیائی لحاظ سے ملحقہ علاقے ملا کر مسلمانوں کے لیے ایسی آزاد ریاستیں نہ بن جائیں جن کے اجزائے ترکیبی خود مختار اور صاحبِ اقتدار ہوں۔ اس طرح مسلمانانِ ہند نے قائداعظم کی قیادت میں اپنے لیے ایک واضح نصب العین متعین کر لیا۔

دوران جنگ برطانوی حکومت نے اس ارادے کا اظہار شروع کر دیا تھا کہ وہ جنگ کے فوراً بعد برصغیر کو خود مختاری دینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اگست 1940ء میں وائسرائے ہند نے ایک اعلان کیا کہ ایک دفاعی مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو نمائندگی دی جائے گی، نیز کوئی ایسا دستور نہیں بنایا جائے گا جسے ملک کا کوئی بڑا طبقہ منظور نہ کرے۔ مارچ 1942ء میں برطانوی کابینہ کا ایک وزیر سرسٹیفورڈ کرپس اپنی حکومت کی طرف سے ایک پیش کش لے کر آیا، مگر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ جون 1945ء میں لارڈ ویول وائسرائے ہند نے برطانوی حکومت کی جانب سے متحدہ ہندوستان کی سیاسی پارٹیوں پر مشتمل ایک عارضی حکومت کے قیام کی پیش کش کی جس میں دفاع کے علاوہ تمام شعبے ہندوستانی ممبروں کے پاس ہوں گے، لیکن اس منصوبے کو بھی مسلم لیگ اور کانگرس نے نامنظور کر دیا۔

اس وقت متحدہ ہندوستان کی دو بڑی اور اہم سیاسی جماعتیں مسلم لیگ اور کانگرس تھیں۔ کانگرس بنیادی اور عملی طور پر ہندوؤں کی جماعت تھی جب کہ وہ ہندوستان کے تمام فرقوں اور قوموں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کرتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ برصغیر کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہمیشہ کانگرس سے علیحدہ رہی اور یہ کہ صرف مسلم لیگ کو ہی مسلمانوں کی واحد

نمائندہ جماعت کہلانے کا حق تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے کانگرس کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے۔ قائداعظم کے قول کی تصدیق 46-1945ء کے موسم سرما میں ہونے والے مرکزی اور صوبائی انتخابات کے نتائج نے بھی کر دی۔ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستیں بھاری اکثریت سے جیت لیں اور صوبوں میں مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کی قریباً" 90 فی صد نشستیں حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی صرف اور صرف مسلم لیگ ہی کرتی ہے۔

مارچ 1946ء میں برطانوی کابینہ کے تین وزرا پر مشتمل ایک وفد جسے کیبنٹ مشن کہتے ہیں، ہندوستان آیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے بعد وفد نے اپنا منصوبہ دونوں سیاسی جماعتوں کو پیش کیا اور کہا کہ یا تو اسے مکمل طور پر قبول کر لیں یا پھر اسے مسترد کر دیں۔ مذکورہ منصوبے میں مزید درج تھا کہ جو سیاسی جماعت اسے کلی طور پر قبول کرے گی، اسے عارضی حکومت بنانے کی پیش کش کی جائے گی جب تک کہ تمام سیاسی جماعتوں کے لیے قابل قبول آئین نہ بن جائے۔ مسلم لیگ نے اس منصوبے کو قبول کر لیا مگر کانگرس نے اسے مسترد کر دیا۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس صورت میں مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جاتی مگر وائسرائے نے کانگرس سے ساز باز کر کے کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ یہ صریحاً" بے اصولی اور جانبداری تھی لہٰذا مسلم لیگ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور وزارتی وفد کے منصوبے کو مسترد کر دیا۔ بعد میں وائسرائے ویول کی درخواست پر اور مسلمانانِ ہند کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلم لیگ نے بھی عبوری حکومت میں شمولیت کر لی مگر آزادی کا مسئلہ بدستور تعطّل کا شکار رہا۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ میں لارڈ اٹیلی کے زیر قیادت لیبر پارٹی برسراقتدار آئی۔ لیبر پارٹی اور کانگرس کے مابین دوستانہ مراسم پہلے سے تھے، کیونکہ لیبر پارٹی، کانگرس کی ہم خیال تھی اور ہندوستان کی تقسیم کی مخالف تھی۔ مگر 46-1945ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی کے پیش نظر لیبر پارٹی بھی تقسیمِ برصغیر پر راضی ہو گئی۔ ان حالات میں ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن 22 رمارچ 1947ء کو ہندوستان پہنچے۔ ہندوستان پہنچتے ہی انھوں نے سب سے پہلے کانگرسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کیا اور بعد میں قائداعظم سے ملاقات کی۔

لارڈ اٹیلی نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ جون 1948ء تک بہر صورت اقتدار ہندوستان کو منتقل کر دینا چاہتی ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سیاسی تعطّل کا جو حل پیش کیا وہ کانگرس کے لیے تو بہت سود مند ثابت ہوا مگر اس سے مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وائسرائے کی تقرری سے پیشتر ہی ماؤنٹ بیٹن کے نہرو خاندان سے گہرے تعلقات تھے جب کہ اس کے برعکس قائداعظم کو اس لیے بھی ناپسند کرتے تھے کہ وہ کانگرس اور انگریزوں کی چالوں اور حیلہ سازیوں کے باوجود مطالبہ پاکستان کے بارے میں اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ قائداعظم نے اپنی ولولہ انگیز قیادت سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنا دیا تھا' یہاں تک کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمان پاکستان کے حصول کے لیے ہر ایثار و قربانی کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ ان حالات میں وائسرائے نے 3 رجون 1947ء کو ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ ایک تحقیق کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے اس منصوبے کی منظوری خفیہ طور پر پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں سے پہلے ہی سے حاصل کر لی تھی' جب کہ مسلمان زعما کو اس سلسلے میں بے خبر رکھا گیا۔
اس منصوبے کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1- متحدہ ہندوستان کو دو حصوں میں (پاکستان اور بھارت) میں تقسیم کر دیا جائے۔
2- صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کے صوبوں کی اسمبلیوں کے مسلمان اور ہندو اراکین کے الگ الگ اجلاس ہوں گے اور اگر انھوں نے تقسیم کا فیصلہ کیا تو ان صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے۔
3- سندھ اسمبلی کے اراکین فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔
4- صوبہ سرحد میں استصوابِ رائے سے فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ صوبہ پاکستان میں شامل ہو یا بھارت میں۔
5- آسام کے مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کے مستقبل کا فیصلہ بھی استصوابِ رائے سے ہوگا۔

6- بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین کو بھی حق دیا جائے گا کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ شمولیت چاہتے ہیں۔

7- اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو تو سرحدوں کے تعین کے لیے باؤنڈری کمیشن مقرر کیے جائیں۔

8- شاہی ریاستیں Princely States کیبنٹ مشن پلان (1946ء) کے اعلان کے مطابق اپنے مخصوص حالات اور جغرافیائی حیثیت کی روشنی میں کسی ایک مملکت میں شمولیت کا فیصلہ کریں گی۔

9- حکومت برطانیہ جون 1948ء سے بھی پہلے اقتدار ہندوستانیوں کو دینا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے اعلان کیا کہ اقتدار 15 راگست 1947ء تک منتقل کر دیا جائے گا۔

اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کے اس منصوبے کی وجہ سے پاکستان کو سخت نقصان پہنچا پھر بھی یہ مسلم لیگ کی فتح تھی کہ حکومت برطانیہ نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم کا اصول مان لیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے 9 رجون 1947ء کو منظور کی گئی ایک قرار داد میں کہا گیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کی کونسل پنجاب اور بنگال کی تقسیم اصولی طور پر قبول نہیں کرتی، تاہم وہ اس منصوبے کے بنیادی اصولوں کو مصالحت کے طور پر قبول کرتی ہے۔

3 رجون 1947ء کے منصوبے کی رو سے صوبہ سرحد اور ضلع سلہٹ میں استصواب رائے نیز بلوچستان میں شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپلٹی کی مطلوبہ رائے مسلم لیگ کے لیے ایک چیلنج تھا۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کیا جس سے وہ بطریق احسن سرخرو ہوئے۔ ان علاقوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

18 رجولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیم ہند کو منظور کر کے اسے قانون بنا دیا جو قانون آزادی ہند 1947ء کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے 15 راگست 1947ء کو پاکستان اور بھارت میں آزاد مملکتیں قائم کرنا قرار پائیں جنھیں نو آبادیاتی درجہ حاصل ہوگا، نیز برطانوی ہند پر برطانوی راج ختم ہو جائے گا۔

قانون آزادی ہند 1947ء کی اہم دفعات کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے :

1- برطانوی ہند کو دو آزاد ریاستوں (Sovereign States) میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

2- ان دونوں ممالک کے کسی حصے اور کسی معاملے پر برطانوی حکومت کی عمل داری نہیں رہے گی۔ دونوں ممالک کے قانون ساز اداروں کو اپنے اپنے ملک میں قانون سازی کے مکمل اور جامع اختیارات ہوں گے۔

3- جب تک دونوں ممالک کے اپنے آئین تشکیل نہیں پاتے' حکومت کا نظام حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء ایکٹ کے تحت چلایا جائے گا۔ اس میں قانون آزادی ہند 1947ء کی روشنی میں ضروری ترامیم کی جا سکیں گی۔

4- 31 رمارچ 1948ء تک ہر دو ممالک کے اپنے اپنے گورنر جنرل کو اپنے اپنے ملک میں ضروری ترامیم کا حق حاصل رہے گا۔ اس کے بعد دونوں ممالک کی مقننہ جات بھی اس کو جاری رکھنے یا اس میں ترمیم کا حق رکھیں گی۔ (یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان کی کسی مقننہ یا عہدے دار کو حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء میں ترمیم کا حق حاصل نہیں تھا۔ صرف برطانوی پارلیمنٹ ہی ایسا کر سکتی تھی)۔

5- تاج برطانیہ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ بھارت یا پاکستان کی مقننہ جات کے منظور کردہ قوانین کو نامنظور کر دے۔ یہ اختیار صرف متعلقہ گورنر جنرل کو حاصل ہوگا۔

6- حکومت برطانیہ اور شاہی ریاستوں (Princely States) کے حکمرانوں کے درمیان کیے گئے معاہدے منسوخ ہو جائیں گے۔ اب یہ ریاستیں اپنے تعلقات متعلقہ مملکت سے گفت و شنید سے طے کریں گی۔

7- برطانیہ کے بادشاہ کے خطابات سے "شہنشاہ ہند" کا خطاب ختم کر دیا گیا۔

اس قانون کے تحت قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔

**ریڈ کلف ایوارڈ اور اس کی ناانصافی :** 3رجون 1947ء کے منصوبے کے تحت پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں نے ان صوبوں کی تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا' لہذا وائسرائے نے بنگال اور پنجاب کے لیے دو باؤنڈری کمیشن 30 رجون 1947ء کو مقرر کیے۔ ان دونوں کمیشنوں کا مشترکہ

صدر سر سیرل ریڈ کلف ایک برطانوی وکیل مقرر کیا گیا۔

دونوں مملکتوں کے مابین حد بندی کا کام نہایت اہم اور نازک نوعیت کا تھا' اس لیے قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ کام اقوام متحدہ کی نگرانی میں کسی غیر جانبدار ادارے کے سپرد ہونا چاہیے لیکن کانگرس نے اسے منظور نہ کیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ کی پریوی کونسل (Privy Council) کے ججوں کے ذریعے حد بندی کا کام کروایا جائے' لیکن اس بار ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس کا کردار ادا کیا اور اس تجویز سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسے نامنظور کر دیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 3 رجون 947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے منصوبے کا اعلان کرتے وقت پاکستان کی جو جغرافیائی حدود بیان کی تھیں' ان کی رو سے کمل آسام کے علاوہ مشرقی پنجاب کے اضلاع گورداسپور' فیروزپور اور جالندھر کے مسلم اکثریت والے علاقوں کی پاکستان میں شمولیت کا ہر ممکن امکان تھا' مگر ریڈکلف نے حد بندی کے کام میں انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صریحاً جانبداری سے کام لیا اور پاکستان کو بعض انتہائی اہم علاقوں سے محروم کر دیا۔ یہ فیصلہ ریڈ کلف ایوارڈ کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے پاکستان کے لیے ایسے مسائل پیدا ہو گئے جو آج تک اس کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

پنجاب کی حدبندی میں ریڈکلف نے مسلم اکثریت کی تحصیلیں' گورداسپور' بٹالہ' فیروزپور اور زیرہ بھارت میں شامل کر دیں۔ اسی طرح ایک انتہائی گہری سازش کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو بعد میں بھارت سے ملانے کے لیے گورداسپور کے ذریعے راستہ مہیا کیا گیا اور یوں کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کی راہ ہموار کی گئی۔ مغربی پنجاب کی کئی نہروں کے ہیڈورکس بھارت کو دے دیے گئے اور یوں نہری پانی کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ بنگال کی حد بندی کے ایوارڈ میں کلکتہ کا شہر اور بندرگاہ' ضلع مرشد آباد اور ندیہ کے علاقے بھارت میں شامل کر دیے۔

ریڈ کلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "یہ ایوارڈ غیر منصفانہ' ناقابلِ فہم بلکہ غیر معقول ہے۔ چونکہ میں اس پر عمل کرنے کا عہد کر چکا ہوں' اس لیے یہ ہم پر لازم ہے"۔

# پاکستان کے ابتدائی مسائل

**انتظامی امور:** بھارت نے شروع ہی سے پاکستان کے لیے لاتعداد مسائل کھڑے کر دیے۔ پاکستان کے پاس شروع شروع میں وسائل کی بہت کمی تھی' یہاں تک کہ روز مرہ کے عام سرکاری کام چلانے میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انتہائی محدود وسائل کے باوجود قوم میں جذبہ تعمیر کی کمی نہ تھی۔ پاکستانی قوم احساسِ محرومی اور کمتری کا شکار نہیں ہوئی بلکہ وہ قومی جذبے سے سرشار تعمیر وطن کے لیے تیار ہو گئی۔ کیوں نہ ہوتی! ان کے قائد کی مثال اور اس کی رہنمائی ان کی ہمسفر تھی۔

کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ مرکزی حکومت کے کئی دفاتر مناسب سرکاری عمارات نہ ہونے کی وجہ سے بیرکوں میں قائم کیے گئے۔ بعض ریل گاڑیوں پر جن میں پاکستان کے حصّے کا ضروری دفتری ریکارڈ اور سرکاری ملازم دہلی سے پاکستان آ رہے تھے' سفر کے دوران میں ان پر ہندوؤں کی جانب سے حملے ہوئے جس سے بیش قیمت سرکاری ریکارڈ اور ان گنت قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ ایسے دل گداز حالات میں بھی پاکستانی عوام اور سرکاری ملازمین مایوس نہ ہوئے بلکہ زیادہ تندہی سے ملکی کاموں میں حصہ لینے لگے۔

**مہاجرین کا مسئلہ:** تقسیمِ برصغیر ہند کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے ایک باقاعدہ سکیم کے تحت پورے بھارت میں بالعموم اور مشرقی پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کے استحصال کی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں انسانیت دشمن ہندوؤں اور سکھوں نے ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کو انتہائی بے دردی و سنگدلی سے قتل کیا اور بے آبرو کیا۔ روزانہ لاکھوں تباہ حال' فاقہ زدہ زخمی مہاجرین بھارت سے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ مسلمان مہاجرین کے ان قافلوں کے لیے قیام' خوراک' طبی امداد' تعلیم' روزگار اور مستقل آباد کاری کا انتظام ضروری تھا لیکن اس کے لیے بے پناہ وسائل کی ضرورت تھی' جن سے نوزائیدہ مملکت محروم تھی۔ مہاجرین کے عارضی قیام کے لیے جو کیمپ لگائے گئے۔ وہ بھی بہت ناکافی ثابت ہوئے۔ نتیجتاً مہاجرین نے مجبوراً سڑکوں کے کنارے' درختوں کے نیچے اور فٹ پاتھوں پر پناہ لی۔ پاکستان کی انتظامیہ کے

لیے مہاجرین کا مسئلہ ایک چیلنج سے کم نہ تھا مگر حکومت اور عوام نے مل کر اسے حل کیا۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں کبھی بھی کسی قوم کے لوگوں کا کسی ملک سے اخراج نہیں ہوا، جتنی تعداد میں بھارت سے مسلم مہاجرین پاکستان میں آ کر آباد ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق 1948ء تک سوا کروڑ مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے اور ان کی تعداد بتدریج بڑھتی رہی۔

پاکستان میں آنے کے بعد اگر مہاجرین حوصلہ ہار دیتے اور مایوسی کا شکار ہو جاتے یا اہل پاکستان خود غرضی کا مظاہرہ کرتے یا حکومت پاکستان کے عزم میں کوئی فرق آ جاتا تو مملکت پاکستان کے لیے مزید مشکلات کے دروازے کھل سکتے تھے، مگر ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ پاکستان کے عوام اور نو وارد مہاجرین قائداعظم کی رہنمائی اور قیادت میں نیا عزم لیے ہوئے تھے۔

**اثاثوں کی تقسیم:** تقسیم ہند کے وقت طے پایا تھا کہ برطانوی ہند کے اثاثوں کی تقسیم بھی پاکستان اور بھارت کے مابین ہو گی، مگر کانگرس اور ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہت ہی کم سامان پاکستان پہنچایا گیا۔ متحدہ ہندوستان کا 4 ارب روپے کا محفوظ سرمایہ تھا۔ معاہدے کے مطابق اس میں سے ایک چوتھائی یعنی ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آنا تھا لیکن بھارت نے صرف بیس کروڑ روپے دیے اور مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس متحدہ ہندوستان کے قرضہ جات کا 20 فی صد پاکستان کے ذمے ڈال دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ اثاثہ جات کی رقوم کو روک کر کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ نومبر 1947ء میں اس سلسلے میں پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے مابین دہلی میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ قومی قرضوں میں پاکستان کا حصہ $17\frac{1}{2}$ فی صد ہوگا۔ دسمبر 1947ء میں دونوں حکومتوں نے اس معاہدے کی توثیق کر دی مگر اس کے باوجود بھی ہندوستان کی حکومت نے بقایا رقم دینے سے انکار کر دیا۔

**افواج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم:** تقسیم ہند کے وقت افواج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ بڑا حساس اور نازک تھا۔ انگریز کمانڈر انچیف افواج کی تقسیم کے خلاف تھا مگر قائداعظم کی دلیل یہ تھی کہ ایک ملک کی اپنی خود مختار فوج ہونی چاہیے کیونکہ فوج کا کام نہ صرف ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہوتا ہے بلکہ اسے ملک کی تعمیر میں بھی حصہ لینا ہوتا ہے۔ تقسیم افواج کے لیے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی گئی جس کا سربراہ کمانڈر انچیف تھا۔ یہ طے پایا کہ افواج کی تقسیم کا کام کیم

اپریل 1948ء تک مکمل ہو جانا چاہیے۔

افواج کی تقسیم کے ساتھ ہی یہ طے پایا تھا کہ متحدہ ہندوستان کے فوجی ساز و سامان کا ایک تہائی حکومت پاکستان کو ملے گا۔ تقسیم ہند کے وقت اسلحہ بنانے والی قریباً" تمام فیکٹریاں بھارتی علاقے میں تھیں۔ نیز فوجی ذخائر کے ڈپو بھی ان علاقوں میں تھے' جو بھارت میں شامل ہوئے۔ ایک سازش کے تحت بھارتی حکومت نے اسلحہ ساز فیکٹریوں کو پاکستان منتقل کرنے سے انکار کر دیا اور ڈپوؤں میں موجود اسلحے کو پاکستان بھیجنے کا کام التوا میں ڈال دیا تاکہ جہاں تک ممکن ہو پاکستان کو اس کے جائز فوجی اثاثوں سے بھی محروم کر دیا جائے۔

بھارت نے افواج کے بھیجنے اور فوجی اثاثوں کی تقسیم پر ایسے ایسے روڑے اٹکائے کہ انگریز کمانڈر انچیف نے نہرو حکومت کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا۔ اس سے افواج کی تقسیم کے کام میں پاکستان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کمانڈر انچیف نے برطانوی حکومت کو اپنی ایک خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ نہرو حکومت یہ مصمّم ارادہ کر چکی ہے کہ جہاں تک ہو سکے' وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے دور رکھے گی۔

**نہری پانی کا مسئلہ :** پنجاب کی غیر منصفانہ اور غلط طریقے سے تقسیم کے نتیجے میں نہری پانی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ریڈ کلف نے حد بندی کے فیصلے میں دریائے راوی پر مادھو پور کا ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز پور کا ہیڈ ورکس بھارت کو دے دیے' جب کہ یہاں سے نکلنے والی نہریں پاکستان میں واقع ہیں اور وسیع پاکستانی علاقے کے لیے آبپاشی کا ذریعہ ہیں۔ یکم اپریل 1948ء کو بھارت نے ان ہیڈ ورکس سے پاکستانی نہروں کا پانی بغیر پیشگی اطلاع کے بند کر دیا۔ اس فعل سے بھارت کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان نہروں سے سیراب ہونے والی پنجاب کی زرعی زمین بے آب و گیاہ صحراؤں میں تبدیل ہو جائے اور پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے مشرقی دریاؤں یعنی راوی' بیاس اور ستلج پر ملکیت کا دعویٰ کیا۔ بھارت کا یہ دعویٰ بین الاقوامی قانون کے خلاف تھا چنانچہ پاکستان نے اقوام متحدہ سے رجوع کیا۔ عالمی بینک نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ طویل مذاکرات کے بعد 1960ء میں سندھ طاس کا معاہدہ طے پایا جس کی توثیق دونوں حکومتوں نے 1961ء میں کر دی۔ اس معاہدے کے مطابق یہ طے پایا کہ تین مشرقی دریاؤں (ستلج' بیاس' راوی) کے استعمال کا حق بھارت کو حاصل

ہو گا اور تین مغربی دریا (چناب، جہلم اور سندھ) پاکستان کے حوالے کر دیے گئے۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے بعد نہری پانی کا مسئلہ اب بہت حد تک حل ہو گیا ہے۔

**ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ :** قانون آزادی ہند 1947ء میں حکومت برطانیہ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد برطانوی اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہو جائے گا لہٰذا 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کے مطابق والیانِ ریاست کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور رعایا کی خواہشات کے مطابق پاکستان یا بھارت جس کے ساتھ وہ چاہیں، شامل ہو سکتے ہیں چنانچہ بہاولپور، لس بیلہ، مکران، قلات اور صوبہ سرحد کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہو گئیں ان کے علاوہ جوناگڑھ، مناوادر اور منگرول نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا مگر بھارت نے زبردستی ان پر قبضہ کر لیا۔ تقسیم ہند کے وقت ان تینوں ریاستوں کے مسلم حکمرانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا، کیونکہ ان ریاستوں کا پاکستان سے سمندر کے راستے آزادانہ رابطہ قائم ہو سکتا تھا۔ بھارتی حکومت نے ان کے الحاق پر حکومت پاکستان سے احتجاج کیا مگر قائداعظم نے کہا کہ یہ ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد اب پاکستان کا حصہ بن چکی ہیں۔ ان ریاستوں پر بھارت کی طرف سے دباؤ ڈالنے کا مطلب پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہو گا۔ قائداعظم کی قیادت میں بھارت کو ان ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ کی جرأت نہ ہوئی، لیکن ان کی وفات کے بعد نومبر 1948ء میں بیس ہزار بھارتی فوج جوناگڑھ میں داخل ہو گئی اور ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ جوناگڑھ کے حکمران نے بھاگ کر کراچی میں پناہ لی۔ بھارت نے یہ کہہ کر اس ریاست پر قبضہ کر لیا کہ وہاں کے عوام بھارت سے الحاق چاہتے تھے، لیکن یہ اصول بھارت نے مشرقی پنجاب کی ریاست نابھا اور کشمیر میں تسلیم نہیں کیا۔ نابھا کی 64 فی صد آبادی مسلم تھی اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملی ہوئی تھی نیز وہاں کے مسلم عوام بھی پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے، لیکن بھارتی حکومت نے نابھا کے راجا کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے باز رکھا۔

ریاست جموں و کشمیر برصغیر کی تمام شاہی ریاستوں میں سے ایک نہایت ہی اہم ریاست تھی جس کی قریباً ایک ہزار کلومیٹر لمبی سرحد پاکستان کے ساتھ ملتی ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی چالیس لاکھ تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی 96 فیصد ا، حرّا

میں مسلمانوں کی آبادی 70 فیصد تھی۔ نسل، تمدّن، خوراک، رسم و رواج اور لباس کے اعتبار سے ریاست کشمیر کے مسلمان، پاکستان کے مسلمانوں کے بہت قریب ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے سب دریا بہہ کر پاکستان میں آتے ہیں۔ ریاست کے تینوں راستے (1) سرینگر جموں، سیالکوٹ (2) سرینگر ایبٹ آباد اور (3) سرینگر راولپنڈی، پاکستان آتے ہیں۔ ان کے علاوہ 1947ء میں ریاست جموں و کشمیر کا بیرونی دنیا سے بذریعہ سڑک کوئی راستہ نہ تھا مگر کانگرس، ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کے گٹھ جوڑ نے انتہائی دھاندلی سے کام لیتے ہوئے، گورداسپور کا علاقہ بھارت میں شامل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو براستہ کٹھوعہ جموں تک راستہ مہیا کر دیا گیا جس سے کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کی سازش اور انتظامات مکمل ہو گئے۔ اندریں حالات وہاں کے ہندو راجا نے بھارت کے ساتھ الحاق کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مہاراجہ نے ریاست کی فوج اور پولیس میں سے تمام مسلمان ملازمین کو برخاست کر کے ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔ حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خلاف پونچھ کے مسلم مجاہدین نے اپنی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے۔ مظلوم مسلمانوں کو مہاراجہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ وہ کیمپوں میں جمع ہو جائیں تاکہ انھیں بحفاظت سیالکوٹ پہنچا دیا جائے۔ اس طرح دھوکہ دے کر نہتے مسلمانوں کو کیمپوں میں جمع کر کے ان کا قتلِ عام کیا گیا۔ اس قتلِ عام کی خبر سن کر بہت سے قبائلی اور پاکستان سے بہت سے رضاکار اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے ریاست میں داخل ہوئے اور تیزی سے سرینگر کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ 24 اکتوبر 1947ء کو آزاد کشمیر حکومت کا اعلان کیا گیا۔ مہاراجہ بھاگ کر جمّوں پہنچا اور طے شدہ سازش کے تحت بھارت سے فوجی امداد طلب کی۔ مہاراجہ کی بھارت میں زبانی شمولیت پر بھارتی حکومت نے ریاست جمّوں و کشمیر میں اپنی باقاعدہ فضائیہ اور بری افواج بڑی تعداد میں داخل کر دیں۔

قیام پاکستان کے وقت مہاراجہ نے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے تک پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ جاریہ یعنی (حالات جوں کے توں رکھنے کا معاہدہ (Agreement of Status Quo) کیا تھا لہٰذا قائداعظم نے اعلان کیا کہ اس نام نہاد الحاق کو درج ذیل وجوہات کی بنا پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا:

1- بھارت کے ساتھ ریاست جموں و کشمیر کا نام نہاد الحاق عوام کی خواہشات کے منافی ہے۔

2- معاہدہ جاریہ کی موجودگی میں مہاراجہ یک طرفہ طور پر حالات کی تبدیلی کا مجاز نہیں۔

3- جس وقت مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کی پیشکش کی' اس وقت ریاست کے ایک بڑے حصے پر اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔

اس موقع پر پاکستان نے براہِ راست بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ یکم نومبر 1947ء کو قائداعظم نے اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن سے گفت و شنید کی لیکن پنڈت نہرو نے مخالفت کی۔

جب بھارتی فوج قوت سے ریاست پر قبضہ کرنے میں ناکام رہی تو یکم جنوری 1948ء کو بھارتی حکومت نے مسئلہ کشمیر' سلامتی کونسل میں پیش کیا اور کہا کہ ریاست میں امن و امان بحال ہونے پر وہ کشمیری عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے غیر جانبدارانہ طور پر رائے شماری کروائے گا۔

کشمیر کے مسئلے کے حل کی غرض سے سلامتی کونسل نے 12 راگست 1948ء اور 5 رجنوری 1949ء کو دو قراردادیں منظور کیں جن کو پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے بھی تسلیم کیا۔ ان کا لب لباب یہ ہے:

1- جنگ فوری طور پر بند کرا دی جائے اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی نگرانی میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان جنگ بندی لائن کھینچ دی جائے۔

2- دونوں حکومتیں کشمیر سے اپنی اپنی فوجیں ہٹا لیں۔

3- اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصواب رائے کا انتظام کیا جائے۔

سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق جنگ بندی تو ہو گئی لیکن ریاست میں استصواب رائے کی نوبت آج تک نہ آ سکی۔ آج تک کشمیر کا مسئلہ دونوں مملکتوں کی راہ میں کشیدگی کا سبب بنا ہوا ہے۔ 1949ء سے 1953ء کے عرصہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے کئی ناظمِ رائے شماری مقرر ہو کر آئے۔ پاکستان نے ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا لیکن بھارت نے کسی نہ کسی

حیلے ان کی تجاویز کو رد کر دیا۔ 1957ء میں سلامتی کونسل کی کوشش ایک بار پھر بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ 1962ء میں راولپنڈی اور 1963ء میں دہلی میں دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ نے اس مسئلے پر مذاکرات کیے۔ 1964ء میں بھی کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔

مسئلہ کشمیر کی وجہ سے دونوں ممالک کی ایک دوسرے کے ساتھ کئی جنگیں بھی ہو چکی ہیں، مگر بدقسمتی سے بھارت کی روایتی سامراجیت کی وجہ سے آج تک یہ مسئلہ دونوں ممالک کے مابین کشیدگی کا باعث ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ نہ صرف پاکستان کی ابتدائی مشکلات اور مسائل بھارت کے پیدا کردہ ہیں بلکہ پاکستان کا ہر مسئلہ بھارت کا پیدا کردہ ہے جب کہ پاکستان نے شروع ہی سے بھارت کے ساتھ اچھے ہمسائیوں جیسے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

## قائداعظم اور استحکامِ پاکستان

تحریکِ قیامِ پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کا کردار اور ان کی قائدانہ صلاحیتیں اظہر من الشمس ہیں۔ اس تحریک میں قائداعظم کی شخصیت اور ان کی بصیرت ہی نے اتنے مشکل اور کٹھن کام کو آسان بنا دیا اور پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت روئے ارض پر نمودار ہوئی۔

جہاں قیامِ پاکستان کے لیے بے شمار قربانیوں اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت تھی، اس کے قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں بھی سخت محنت اور لگن درکار تھی۔ قائداعظم کی عظیم قیادت نے اس کام کو بہت حد تک آسان بنا دیا۔ انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ایک قومی جذبہ بیدار کر دیا جس کے سامنے دنیا کی کوئی بھی مشکل ہیچ تھی۔ قائداعظم نے کوشش کی کہ ابتدا میں تمام مسائل کا اصولی طور پر حل تلاش کر کے ایسا لائحہ عمل بنا لیا جائے جس پر چل کر ملکی ترقی کی راہوں کی نشاندہی آسانی سے ہو سکے، مگر قدرت نے قیامِ پاکستان کے بعد بہت ہی قلیل عرصے کے لیے ہمارے اس عظیم قائد کی سرپرستی ہمیں عنایت کی۔ قائداعظم کے دور میں جو اہم امور طے ہوئے ان کا اجمالی جائزہ یوں ہے:

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں 11 راگست 1947ء کو ہوا۔ یہ دستور

ساز اسمبلی ان ممبران پر مشتمل تھی جو ان علاقوں سے منتخب ہوئے تھے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہوئے۔ 14 راگست 1947ء کو قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خان کو ملک کا پہلا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ اگرچہ 1935ء کے ایکٹ کے ترمیم شدہ قانون کے مطابق گورنر جنرل کے اختیارات محدود تھے مگر قائداعظم کی عوام میں بے پناہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بدولت ان کو خود بخود وسیع اختیارات حاصل ہو گئے تھے' چنانچہ کئی دفعہ انہوں نے کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی۔ جن اہم امور کی طرف قائداعظم نے فوری و خصوصی توجہ دی اور رہنما اصول بیان کر کے قوم کی رہنمائی کی' ان کا جائزہ درج ذیل ہے۔ قوم نے آپ کی آواز پر لبیک کہا جس کی بدولت نوزائیدہ مملکت نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔

1- مہاجرین کی آباد کاری
2- سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین
3- صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین
4- پاکستان کی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین
5- خارجہ حکمتِ عملی
6- طلبہ کو حصولِ تعلیم کی طرف توجہ دلانا

**1- مہاجرین کی آباد کاری:** قیام پاکستان کے وقت جو مسائل درپیش تھے' ان میں یہ وہ اہم مسئلہ تھا جس کی طرف قائداعظم نے سب سے زیادہ توجہ دی۔ قائداعظم ریلیف فنڈ قائم کیا گیا۔ عوام اور صاحبِ ثروت لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ مالی امداد کریں۔ اکتوبر 1947ء میں آپ کچھ عرصہ کے لیے لاہور تشریف لے گئے تاکہ وہاں مہاجرین کے آنے والے زبردست سیلاب سے پیدا ہونے والے مسائل کا قریب سے جائزہ لے سکیں اور ان لُٹے پُٹے بے سہارا افراد کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کر سکیں۔ 30 راکتوبر 1947ء کو لاہور ہی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "اب یہ ہم پاکستانیوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لاکھوں تباہ حال مہاجرین جو اپنا سب کچھ بھارت میں چھوڑ کر پاکستان آ رہے ہیں' ان کی ہر ممکن امداد کی جائے' انھیں یہ مصیبتیں اس لیے سہنا پڑیں کہ وہ مسلمان ہیں"۔

آپ نے شہریوں سے بھی اپیل کی کہ وہ نہایت صبر سے کام لیں اور ہر لحاظ سے اپنے مہاجر بھائیوں کی آبادکاری میں حکومت کی مدد کریں۔ آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان کے عوام نے بھرپور حصہ لیا۔ ریلیف فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا اور ہر سطح پر مہاجرین کی امداد کی۔

**سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین:** قائداعظم نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا کہ قیام پاکستان کے بعد اب سرکاری افسران کا کردار حاکم کا سا نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ عوام کے خادم بن کر رہیں۔ 25 مارچ 1948ء کو سرکاری افسران سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔ "آپ (سرکاری افسران) کو قوم کے خادم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہئیں۔ آپ کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کوئی بھی سیاسی جماعت برسراقتدار آ سکتی ہے، مگر آپ کا رویہ عوام سے ایسا ہونا چاہیے کہ ان کو احساس ہو کہ آپ حکمران نہیں، آپ قوم کے خادم ہیں۔ آپ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اگر آپ میری نصیحت پر عمل پیرا ہوں گے تو مجھے یقین ہے کہ عوام کی نگاہ میں آپ کا مقام اور مرتبہ بلند ہو گا"۔

قائداعظم کے فرمان کا جملہ افسران اور اہل کاروں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انھوں نے نہایت محنت سے، رات دن ایک کر کے ابتدائی بحران سے پاکستان کو نکالا۔

**3- صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین:** صوبائی اور نسلی خطرے کو بھانپتے ہوئے قائداعظم نے قوم کو بروقت اس کی طرف متوجہ کروایا۔ آپ نے 15 جون 1948ء کو فرمایا۔

"اب ہم پاکستانی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی بلوچی، پٹھان، سندھی، بنگالی اور پنجابی نہیں بلکہ سب پاکستانی ہیں۔ ہماری سوچ اور ہمارا عمل پاکستانی کی حیثیت سے ہونا چاہیے اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے"۔

آپ نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ ان کے مسائل پر توجہ دی۔ ان صوبوں کے عوام کو نئی امید دی اور پاکستان سے وابستگی کے جذبات کو تیز کر کے انھیں نئی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے صوبہ سرحد میں وزیرستان ایجنسی سے فوجیں ہٹا دیں۔ اس طرح اس علاقے کے لوگوں کو یہ احساس دلایا گیا کہ یہ بھی پاکستان کا اٹوٹ انگ ہیں۔ انھوں نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی ایک نئی وزارت قائم کی۔ کراچی کو ملک کا دارالخلافہ بنا دیا۔ ریاستوں کی پاکستان میں

شمولیت کو یقینی بنایا۔ اس میں خاص طور پر مسئلہ ریاستِ قلات کا تھا۔

**4- پاکستان کی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین:** معیشت اور اقتصادیات جیسا اہم مسئلہ بھلا قائداعظم کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا۔ پاکستان کے مستقبل کے مجوّزہ نظام سے متعلق آپ نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر یکم جولائی 1948ء کو فرمایا "مغربی معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاتعداد ناقابلِ حل مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ مغربی طرز کا معاشی نظام ہمارے ملک میں خوش حالی اور ترقی نہیں پیدا کر سکتا' اس لیے ہمیں اپنی بہبود کے لیے کوئی نیا طریقہ وضع کرنا ہو گا اور دنیا کو ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہو گا' جس کی بنیادیں اسلامی مساوات اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہوں۔ ایسا کرنے سے ہم مسلمان قوم کی حیثیت سے دنیا کو ایک ایسا معاشی نظام دینے میں کامیاب ہو جائیں گے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے امن کا پیغام بن کر آئے گا۔ یاد رہے کہ امن ہی سے انسانیت کی بقا اور خوش حالی قائم رہ سکتی ہے"۔

اس کے ساتھ ساتھ فوری مسئلہ لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔ دوسری طرف بھارت نے تقسیم کے اصول کے مطابق پاکستان کے حصّے میں آنے والے سرمایہ سے ایک کثیر رقم پاکستان کو ادا نہ کی تھی۔ اس طرح اس نئے ملک کو ابتدا ہی میں شدید مالی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ قائداعظم نے اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لیا۔ انھوں نے مہاجرین کے لیے ایک ریلیف فنڈ قائم کیا جس سے صورت حال کسی حد تک سنبھل گئی۔

**5- خارجہ حکمتِ عملی:** قیام پاکستان کے فوراً" بعد قائداعظم نے پاکستان کو اقوامِ متحدہ کا رکن بنانے کی طرف توجہ دی۔ قائداعظم کی ہدایات کے مطابق قیامِ پاکستان سے چند مہینوں کے اندر بہت سے ممالک کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ آپ کی خارجہ پالیسی میں مسلمان ممالک کے مابین اتحاد کا عنصر غالب رہا۔ آپ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تمام ممالک سے بالعموم اور ہمسایہ و مسلم ممالک سے بالخصوص برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔

ابتدا ہی میں پاکستان کو خارجی معاملات میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل کا محرک بھارت تھا۔ مسائل کی مختصراً" تفصیل یہ ہے۔

نومبر 1947ء میں ریاست جوناگڑھ پر جس نے بنیادی طور پر پاکستان میں شامل ہونے کا

فیصلہ کیا تھا' بھارت نے فوج کشی کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔

کشمیر کے مسلمانوں پر بھارت نے مظالم ڈھانا شروع کر دیے اور ساتھ ہی پاکستانی سرحدوں کے ساتھ اپنی افواج ڈال دیں۔ نتیجے کے طور پر ایک جنگ بھی پاکستان پر تھوپ دی گئی جس کا مجموعی حالات میں پاکستان متحمل نہیں ہو سکتا تھا' مگر ہمارے جری و بہادر جوانوں نے اپنی جواں ہمتی سے دشمن کو شکست دی۔

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے آپ نے بھارتی حکومت سے مذاکرات شروع کیے اور برطانوی حکومت کے دفترِ دولتِ مشترکہ سے مسلسل مراسلت بھی کرتے رہے۔ اس کا مقصد دولت مشترکہ کے دفتر کو مجبور کرنا تھا کہ وہ دونوں مملکتوں میں پائی جانے والی کشیدگی کو کم کرنے اور اس علاقے میں امن و استحکام قائم کرنے کی کوئی تدبیر کرے۔

6۔ **طلبہ کو حصولِ تعلیم کی طرف توجہ دلانا :** کسی بھی معاشرے میں نوجوانوں کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے' قائداعظم اس سے بخوبی آشنا تھے۔ نوجوان ہی کسی ملک کا مستقبل ہوتے ہیں۔ اسی بات کے پیشِ نظر پشاور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی تمام تر توجہ حصولِ تعلیم پر مرکوز کریں۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں طلبہ نے جو اہم کردار ادا کیا' قائداعظم نے اس کی تعریف کی اور فرمایا کہ طلبہ کو اب احتجاجی سیاست سے بالکل گریز کرنا ہو گا' اسی میں پاکستان کی بقا اور خوشحالی ہے۔

قائداعظم نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور تدبر کی بدولت مسلمانانِ برصغیر کے لیے نہ صرف ایک علیحدہ مسلم ریاست حاصل کی بلکہ اس کو مستحکم کرنے کے لیے کام بھی کیا اور رہنما اصول بھی بیان کیے۔ اب ہم پر لازم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک مملکت خداداد پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اپنا بھرپور' مثبت اور فعال کردار ادا کرے تاکہ جو خواب مسلمانانِ جنوبی ایشیا نے قائداعظم کی والہانہ قیادت میں دیکھا تھا' صحیح معنوں میں شرمندۂ تعبیر ہو اور یہ قطعۂ زمین حقیقی معنوں میں اسلام کا قلعہ اور اس کی سرزمین ثابت ہو۔

## سوالات

(الف) 1- 1940ء سے قیام پاکستان تک کے برصغیر کے سیاسی حالات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

2- پاکستان کے قیام کے بعد ابتدائی مسائل اور ان میں پاکستانی عوام کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

3- قائداعظم محمد علی جناح نے استحکام پاکستان کے لیے کیسے رہنمائی کی؟

(ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگایئے:

1- پہلی جنگ عظیم نے انگریزوں کے عالمی اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔

2- 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں ____ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

(آل انڈیا مسلم لیگ، یونینسٹ پارٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

3- برطانوی کابینہ کا وزیر سرسٹیفورڈ کرپس ____ میں ہندوستان آیا۔

(6 رجون 1940ء، مارچ 1942ء، 4 رجون 1947ء)

4- 1945-46ء کے موسم سرما میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔

5- ____ کو ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا گیا۔

(6 رجون 1940ء، 3 رجون 1947ء، 14 راگست 1947ء)

6- 18رجولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیمِ ہند کو منظور کر کے اسے قانون بنا دیا۔

7- تقسیمِ ہند کے وقت پنجاب کی حد بندی میں گورداسپور، بٹالہ، فیروزپور کی تحصیلوں کو ناجائز طور پر بھارت میں شامل کر دیا گیا۔

8- اثاثوں کی تقسیم سے متعلق پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے مابین ____ میں کانفرنس ہوئی۔ (لاہور، دہلی، بمبئی)

9- ــــــ نے ریاست جموں و کشمیر کی پولیس اور فوج میں سے تمام مسلمان ملازمین کو برخاست کر کے ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔

(مہاراجہ کشمیر، بھارتی حکومت، انگریز وائسرائے)

10- قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور تدبیر کی بدولت مسلمانانِ برصغیر کے لیے نہ صرف ایک علیٰحدہ مسلم ریاست حاصل کی بلکہ اس کے استحکام کے لیے بنیادی اصول سمجھائے۔

(ج) مختصر جواب لکھیے:

(i) مسلمانانِ برصغیر کی ایک سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے جن مسلمان زعما نے خاص طور پر خدمات سرانجام دیں، ان میں سے صرف پانچ کے نام لکھیے۔

(ii) متحدہ ہندوستان میں مغربی جمہوریت کے نفاذ کا مطلب مسلمانوں کے لیے کیا ہو سکتا تھا؟

(iii) کیبنٹ مشن کب ہندوستان آیا؟

(iv) تقسیم برصغیر کے وقت برطانیہ میں کون سی پارٹی برسراقتدار تھی؟

(v) تقسیمِ برصغیر کے منصوبہ کے تین اہم نکات لکھیے۔

(vi) قانون آزادی ہند 1947ء کی تین اہم دفعات لکھیے۔

(vii) ریڈ کلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے کیا فرمایا؟

(viii) سندھ طاس کا منصوبہ کیا تھا؟

(ix) 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جمّوں و کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کیا تھا؟

3

# مسلمانوں کی جمہوری ریاست کا قیام

پاکستان 14 راگست 1947ء کو ایک نئے ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آیا۔ پاکستان کا قیام جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ایک طویل جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں ممکن ہوا تھا۔ اس جمہوری جدوجہد کی ابتداء سرسید احمد خان نے 1857ء کی مسلح جدوجہد آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کی تحریک سے کی تھی اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح نے انتھک محنت کی اور ہندو اکثریت کی مخالفت کے باوجود اپنی آئینی لڑائی میں کامیابی حاصل کی اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے حقِ خود ارادیت کا حق تسلیم کرایا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد اگرچہ مملکت کو بہت سی مشکلات کا سامنا تھا تاہم ان کے حل کے ساتھ ساتھ پاکستان کی نئی ریاست کے لیے ایک ایسے جمہوری آئین کی تیاری انتہائی ضروری تھی جو ملک کی مسلمان اکثریت کی روایات اور خواہشات کا آئینہ دار ہو۔ آزادی کے بعد ملک کا کاروبار حکومت ہند کے قانون مجریہ ایکٹ 1935ء اور قانون آزادی ہند 1947ء کے تحت چلایا جا رہا تھا۔ جسے عبوری آئین کے طور پر اختیار کر لیا گیا تھا۔ ملک کے لیے مستقل آئین بنانے کا کام دستور ساز اسمبلی کو سونپا گیا۔ دستور ساز اسمبلی 1946ء کے انتخابات کی بنیاد پر قائم کی گئی۔

پاکستان میں آئین سازی جمہوری روایات کو اپنانے اور ان پر عمل کرنے کی تاریخ خاصی افسوسناک ہے۔ 1956ء میں ملک کا پہلا آئین لاگو کیا گیا جس تک پہنچنے کے لیے ملک کو بہت سے

نشیب و فراز اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں حقِ بالغ رائے دہی کے مطابق پہلے عام انتخابات آزادی کے چوبیس سال بعد منعقد ہوئے اور یہ انتخابات بھی مارشل لاء آرڈر کے تحت ممکن ہوئے جس وقت تک ملک میں دو آئین منسوخ کیے جا چکے تھے اور ملک میں دو بار مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔

آئین سازی کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی اس تقریر میں ایک خاکہ مہیا کر دیا تھا جو انھوں نے 11 راگست 1947ء کو اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے بطور اسمبلی کے صدر کے کی تھی۔ قائداعظم نے اپنے خطاب میں سفارش، اقرباء پروری، رشوت خوری، کام چوری، بددیانتی، ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری جیسی لعنتوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی تعصب کی سختی سے مخالفت کی تھی اور پاکستان کے تمام شہریوں کے لیے مساوی جمہوری اور شہری حقوق کا مژدہ سنایا تھا۔ تاہم ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ آئین بننے سے پہلے ہی 11 رستمبر 1948ء کو انتقال کر گئے۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد مسلم لیگ، جس نے آل انڈیا مسلم لیگ کی حیثیت سے قیامِ پاکستان کے لیے شاندار جمہوری جدوجہد کی تھی۔ غیر جمہوری جوڑ توڑ اور سیاسی سازشوں کا شکار ہو کر بطورِ سیاسی جماعت کے منتشر ہو گئی۔

## قراردادِ مقاصد

آئین سازی کے سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر قرار دادِ مقاصد منظور کی گئی جس کا مقصد ملکی آئین کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرنا تھا۔ اس قرار داد کو پاکستان کے تینوں نافذ ہونے والے اور ایک منظور ہونے سے پہلے ختم ہو جانے والے آئین میں بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی میں منظور ہونے والی اس دستاویز کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) کائنات پر اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا پاکستان کے عوام حاکمیت کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے مطابق بطور ایک امانت کے استعمال کریں گے۔

(2) جمہوریت، مساوات اور عدل کے اسلامی تصورات ملک میں نافذ کیے جائیں گے۔

(3) پاکستان میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔

(4) غیر مسلم اقلیتوں کو اپنے مذہب اور عقائد پر عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں اور روایات کو ترقی دینے کی مکمل آزادی ہو گی۔ اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے جائز حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا۔

(5) ملک میں وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔ جس میں صوبوں کو مقررہ آئینی حدود میں خود مختاری حاصل ہو گی۔

(6) بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

(7) آزاد عدلیہ قائم کی جائے گی۔

قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد دستور ساز اسمبلی نے متعدد کمیٹیاں قائم کیں جن میں سب سے اہم بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور اس کی ذیلی کمیٹیاں تھیں۔ ان کمیٹیوں نے 1950ء میں دستور ساز اسمبلی کو رپورٹ پیش کی جس میں وفاقی پارلیمانی نظام اور دو ایوانی مقننہ (پارلیمنٹ) کے علاوہ آزاد عدلیہ اور بنیادی شہری حقوق کی سفارش کی گئی۔ اس رپورٹ پر دستور ساز اسمبلی نے طویل عرصے تک غور کیا اور ان میں کچھ ترامیم پیش کیں۔ ان مجوزہ ترامیم پر بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے غور کیا اور ترمیم شدہ رپورٹ 1952ء میں اسمبلی میں پیش کی۔

## جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں:

قائداعظم کے انتقال کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے۔ 1951ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ہوئے انھوں نے (بیورو کریٹ) ملک غلام محمد کو گورنر جنرل نامزد کیا۔ ملک غلام محمد کے تقرر سے ایک تو سیاست میں بیورو کریسی کے عمل دخل کی ابتداء ہوئی جس سے بعد میں بہت خرابیاں پیدا ہوئیں۔ نئے گورنر جنرل نے جمہوری روایات کی پامالی کا جو سلسلہ شروع کیا اس سے پاکستانی سیاست بری طرح تباہ ہو گئی۔

دستور ساز اسمبلی ابھی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کر رہی تھی کہ گورنر جنرل نے وزیر اعظم کو برطرف کر دیا اور اس کی توجیح یہ پیش کی کہ ملک میں آئین کی غیر موجودگی میں

وزیر اعظم کے عہدے کا کوئی جواز نہیں ہے اور گورنر جنرل کسی بھی شخص کو دستور ساز اسمبلی کا لیڈر مقرر کر سکتا ہے۔ تاہم انھوں نے خود اپنی اس دلیل کو اس وقت پس پشت ڈال دیا جب خواجہ ناظم الدین کی جگہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرا کو "وزیر اعظم" نامزد کیا۔ نئے وزیراعظم نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹوں اور دستور ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث کی روشنی میں ایک دستوری خاکہ تیار کروایا جو تاریخ میں محمد علی بوگرا فارمولا کے نام سے مشہور ہوا۔

اس فارمولے میں وفاقی پارلیمانی نظام' دوایوانی مقننہ' آزاد عدلیہ' بنیادی حقوق اور سابق مشرقی اور مغربی پاکستان کو مقننہ میں برابری کی بنیاد پر نمائندگی کی سفارش کی۔ امید تھی کہ محمد علی فارمولے کے مطابق آئین بن جائے گا لیکن 1954ء میں گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی تحلیل کر دی۔

اسمبلی کو برخواست کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ محمد علی بوگرا نے خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کو دیکھتے ہوئے اسمبلی میں ایک قرار داد منظور کرانے کی کوشش کی جس کے تحت گورنر جنرل کے اختیارات کم کر کے اس سے اسمبلی تحلیل کرنے یا وزیراعظم کو برطرف کرنے کا اختیار واپس لینا مقصود تھا۔ گورنر جنرل نے اس قرار داد کی منظوری سے پیشتر ہی اسمبلی برخواست کر دی۔ جس کے خلاف اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین نے سندھ چیف کورٹ میں مقدمہ دائر کیا۔

عدالت نے دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کے اقدام کو غلط قرار دیتے ہوئے اپنے فیصلے میں کہا کہ گورنر جنرل کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ گورنر جنرل کی طرف سے سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف فیڈرل کوٹ میں اپیل کی گئی۔ جسٹس منیر نے سندھ کورٹ کے فیصلے کو اس بنیاد پر منسوخ کر دیا کہ دستور ساز اسمبلی آٹھ سال گزرنے کے باوجود آئین بنانے میں ناکام رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی نمائندہ حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ مزید برآں فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ جس قانون کے مطابق سندھ کورٹ نے گورنر جنرل کے اقدام کو منسوخ کیا ہے خود اس قانون کو گورنر جنرل کی تائید ابھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے بعد 11 راگست 1955ء کو ایک اور بیوروکریٹ چوہدری محمد علی

کو وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔

## پاکستان کا پہلا آئین 1956ء:

چوہدری محمد علی نے نئی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے سے ایک سال سے کم مدت کے عرصے میں آئین کا مسودہ اسمبلی میں پیش کر کے اسے منظور کرایا اور 23 ر مارچ 1956ء کو نیا آئین نافذ ہو گیا۔ اس آئین میں 234 دفعات اور چھ ضمیمے شامل تھے۔ آئین میں اسلام کو پاکستان کے تشخّص اور سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا۔

## 1956ء کے آئین کے اہم نکات:

1949ء کی قرار داد مقاصد کو اس آئین میں افتتاحیہ کے طور پر شامل کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا تھا۔ آئین میں کہا گیا تھا کہ تمام اختیارات کو قرآن اور سنت کی روشنی میں بطور امانت استعمال کیا جائے گا۔

آئین میں واضح طور پر یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کے لیے مواقع مہیا کیے جائیں گے اور حکومت پاکستان اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرے گی۔

1956ء کے آئین کے مطابق سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونا لازم تھا۔ نیز کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا جو قرآن و سنت کے منافی ہو۔

آئین میں یہ بھی کہا گیا کہ صدر مملکت ایک کمیشن تشکیل دے گا جو موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر انھیں اسلام کے مطابق ڈھالنے کی سفارش کرے گا۔

## 1958ء کا مارشل لاء:

1956ء کا آئین صرف اڑھائی سال نافذ رہا اور 7 ر اکتوبر 1958ء کو فوج نے جنرل محمد ایوب خان کی قیادت میں آئین کو منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ 14 ر اگست 1947ء سے لے کر 7 ر اکتوبر 1958ء تک کے عرصے میں ملک میں سیاسی جوڑ توڑ، انتشار اور غیر جمہوری ہتھکنڈے اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں لڑائی اور تشدّد سے بھرپور

ایک اجلاس میں ڈپٹی سپیکر کو ایوان کے اندر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ 1951ء میں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد صرف سات سال کے عرصے میں ملک میں چھ حکومتیں تبدیل ہوئیں۔ اس سیاسی انتشار کی وجہ سے ملک میں طویل مدت کی منصوبہ بندی ممکن نہیں رہی تھی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ آزادی کے بعد سے گیارہ سال کی مدت گزرنے کے باوجود عام انتخابات کے انعقاد کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ ان حالات میں عوام سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے مایوس ہو چکے تھے اور ملک میں غیر یقینی کی فضا پائی جاتی تھی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا جنرل ایوب خان کا سیاست میں عمل دخل گورنر جنرل غلام محمد کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ غلام محمد نے ایوب خان کے ذریعے سے خواجہ ناظم الدین سے وزارت عظمیٰ کا استعفیٰ طلب کرنے کے علاوہ ایوب خان کو وزیر دفاع بھی مقرر کیا۔ اس طرح میجر جنرل سکندر مرزا کی صدارت کے دوران ایوب خان نے ملک کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ملک میں فوجی آمریت کی روایت شروع کی۔ میجر جنرل سکندر مرزا جو سیکریٹری دفاع کے عہدے سے قائمقام گورنر جنرل بنے تھے (غلام محمد کے انتقال کے بعد) اور 1956ء میں پاکستان کے جمہوریہ بنائے جانے پر ملک کے پہلے صدر مقرر کیے گئے تھے۔ سکندر مرزا کا غلام محمد، محمد علی بوگرا اور چوہدری محمد علی کے بعد صدارت تک پہنچنا سیاست میں بیوروکریسی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا ایک اور ثبوت تھا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے صرف بیس دن کے بعد جنرل ایوب خان نے سکندر مرزا کو صدارت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا اور انھیں ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ 27 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مکمل اختیارات سنبھال لئے۔

مارشل لاء کے تحت سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ طلبہ کی جمہوری سرگرمیوں اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر بھی مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

آزادی تحریر و تقریر ختم کر دی گئی۔ اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دیا گیا۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ، جس کے تحت پاکستان ٹائمز، امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار شائع ہوتے تھے قبضے میں لے کر ادارے پر ایک میجر جنرل کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان

(APP) کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور غیر ملکی نیوز ایجنسیوں پر اپنے طور پر پاکستان میں خبریں مہیا کرنے پر پابندی لگا کر انھیں اے پی۔ پی یا دوسری پاکستانی ایجنسی پی پی اے (آج کل پی پی آئی) کے ذریعے سے خبریں دینے کا پابند کیا۔

ان اقدامات کے علاوہ ایوب خان نے فوجی عدالتیں تشکیل دے کر انھیں مقدمات کے سمری ٹرائل کا اختیار دیا۔ ان عدالتوں نے مختلف نوعیت کے مقدمات میں بے شمار افراد کو مختلف سزائیں دیں جن میں بہت سے سیاستدان اور سیاسی کارکن بھی شامل تھے۔

مارشل لاء کی انتظامیہ نے متعدّد سیاستدانوں کے سیاست میں حصہ لینے پر بھی پابندی عائد کر دی۔

جنرل ایوب خان نے جمہوریت کو' خاص طور پر پارلیمانی نظام کو پاکستانی عوام کے مزاج کے خلاف قرار دیتے ہوئے ملک میں ایک نیا نظام نافذ کرنے کا فیصلہ کیا جسے "بنیادی جمہوریت" کا نام دیا گیا۔ اس نظام کے تحت براہ راست انتخاب کا طریقہ ختم کر کے اسمبلیوں اور صدر کے انتخاب کے لیے بالواسطہ انتخاب کا طریقہ رائج کیا اور اسّی ہزار ارکان پر مشتمل بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو صدر اور اسمبلی منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ یہ ارکان چالیس ہزار سابق مشرقی پاکستان اور چالیس ہزار مغربی پاکستان سے ہوتے تھے۔

فروری 1960ء میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بنیادی جمہوری ارکان کے ذریعے سے ریفرنڈم میں اعتماد کا ووٹ حاصل کیا اور صدر مملکت کے عہدے پر "منتخب" قرار دیئے گئے۔ ریفرنڈم کے بعد صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا جس نے مئی 1961ء میں اپنی سفارشات صدر کو پیش کیں۔ ان سفارشات کی روشنی میں جنرل ایوب خان نے ایک آئین تیار کرایا جسے 8 رجون 1962ء کو ملک میں نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین میں 250 دفعات اور تین ضمیمے شامل تھے۔

## 1962ء کا آئین اور اس کے اہم نکات:

1956ء کے آئین کی طرح 1962ء کے آئین میں بھی پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا اور قرارداد مقاصد کو افتتاحیہ میں شامل کیا گیا۔ 1962ء کے آئین کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی جس میں ایسے لوگوں کو شامل کیا گیا جو مروّجہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کے غیر

اسلامی پہلوؤں کی نشاندہی کر سکیں۔ یہ ادارہ نئے مسودات قوانین اور انتظامی فیصلوں کی اسلامی حیثیت کے بارے میں رائے دینے کا مجاز تھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں کی حکومت قانوناً پابند نہیں تھی کیونکہ ان کی حیثیت محض مشاورتی ہوتی تھی۔

آئین کے تحت ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ جدید تقاضوں کے مطابق اسلامی فقہ اور تاریخ کی تحقیق کو فروغ دیا جا سکے۔

1964ء میں اس آئین کے تحت ملک میں صدارتی انتخاب منعقد ہوئے جس میں ایوب خان کا مقابلہ قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح متحدہ حزب اختلاف کی متفقہ امیدوار تھیں۔ متحدہ حزب اختلاف میں مسلم لیگ کے ایک دھڑے (کونسل) کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی، عوامی لیگ، نظام اسلام اور دیگر چھوٹی جماعتیں شامل تھیں۔ جنرل ایوب خان خود مسلم لیگ (کنونشن) کے امیدوار تھے۔ جب 1962ء کے آئین کا نفاذ کیا گیا تھا تو سیاسی جماعتوں کی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے کچھ ارکان نے مسلم لیگ کا کنونشن طلب کر کے کراچی میں مسلم لیگ کی بحالی کا اعلان کیا۔ ان افراد کی قیادت چوہدری خلیق الزمان کر رہے تھے۔ انھوں نے کنونشن میں ایوب خان کو مسلم لیگ کا صدر بھی منتخب کیا۔

مسلم لیگ کے دیگر ارکان نے جن کی قیادت ممتاز دولتانہ کر رہے تھے یہ موقف اختیار کیا کہ پارٹی کی بحالی کا فیصلہ کرنے کا اختیار مسلم لیگ کی کونسل کو ہے لہٰذا انھوں نے کونسل کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد کر کے مسلم لیگ کی بحالی کا اعلان کیا۔ اس طرح مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ کنونشن کے ذریعے بحال ہونے والا دھڑا کنونشن مسلم لیگ اور کونسل کے اجلاس میں بحال ہونے والا دھڑا کونسل مسلم لیگ کہلایا۔

صدارتی انتخاب میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ (ملک امیر محمد) اور مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان نے انتظامیہ کو بھرپور طریقے سے ایوب خان کے حق میں استعمال کیا۔ متحدہ حزب اختلاف نے صدارتی انتخاب کے لیے پارلیمانی نظام اور براہ راست انتخابات کا نعرہ لگایا تھا۔ تاہم انتخابات کے بالواسطہ ہونے اور بنیادی جمہوریتوں کے اسّی ہزار ارکان پر سرکاری دباؤ کی وجہ سے ایوب خان انتخاب میں کامیاب قرار دیئے گئے۔

ایوب خان نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی کے نواح میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے بعد 1960ء میں اسلام آباد کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ راولپنڈی عارضی دارالحکومت کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ صدارتی انتخاب میں فتح کے بعد کونشن مسلم لیگ نے ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب خان کی قیادت میں کراچی میں جشن فتح منایا' جس میں پہلی بار نسلی بنیاد پر کراچی میں فساد ہوا اور متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے' کیونکہ کراچی فاطمہ جناح کے حامی علاقوں میں شامل تھا۔ یہ فسادات جو "پٹھان اور مہاجر" کا رنگ اختیار کر گئے تھے ایوب خان کی آمریت کے خلاف پہلا عملی مظاہرہ تھا۔

1964ء کے انتخاب کے موقع پر شروع کی گئی متحدہ حزب اختلاف کی تحریک انتخاب میں ناکامی کے بعد ابھی جاری تھی کہ جون 1965ء میں سندھ میں رن کچھ کے علاقے میں پاکستان ور بھارت کی فوجوں کے درمیان ایک بڑی سرحدی جھڑپ ہوئی جس میں پاکستان نے بھارتی افواج سے وہ دلدلی علاقے خالی کرا لیے جن پر بھارت نے قبضہ کر کے اپنا دعویٰ ملکیت کیا تھا۔ اسی اثناء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں چھاپہ مار کاروائیوں کے بعد بھارت نے پاکستان پر کشمیر میں چھاپہ مار داخل کرنے کا الزام عائد کیا اور گجرات کے نزدیک پاکستان اور کشمیر کی سرحد پر توپخانہ سے گولہ باری کی۔ اس کے جواب میں 31 ر اگست 1965ء کو آزاد کشمیر اور پاکستان کی افواج نے جموں کے نزدیک جنگ بندی لائن عبور کر کے باقاعدہ فوجی کارروائی کا آغاز کر دیا اور 5 ر ستمبر تک بہت اہم فوجی کامیابیاں حاصل کیں۔ کشمیر پر سے اس دباؤ کو ختم کرنے کے لیے بھارت نے 5 اور 6 ر ستمبر کی درمیانی شب کو لاہور' سیالکوٹ اور قصور کے علاقوں میں بین الاقوامی سرحد پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ ایوب خان نے 6 ر ستمبر کو 11 بجے قوم سے خطاب کیا اور بھارت کے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔

مغربی پاکستان میں سندھ' پنجاب اور کشمیر کی سرحدوں پر شروع ہونے والی یہ برّی' فضائی اور سمندری جنگ 17 دن تک جاری رہی جس کے دوران پاکستان کے عوام اور افواج نے اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کے حملوں کو کامیابی سے روکا اور پہلے دن کی ابتدائی کامیابی کے علاوہ جس میں بھارتی افواج لاہور اور سیالکوٹ کے علاقوں میں کچھ پاکستانی علاقوں پر قابض ہو گئی تھیں' بھارت کو کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کرنے دی۔ راجستھان کے بھارتی علاقے اور قصور میں

بھارتی قصبہ کھیم کرن اور کشمیر میں 5 ستمبر تک حاصل کیا ہوا علاقہ پاکستان کے قبضے میں تھا۔ پاکستان کی فضائیہ نے فیصلہ کن انداز سے سترہ روزہ جنگ میں بھارتی فضائیہ پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ جنگ شروع ہوتے ہی امریکہ نے پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد پر پابندی عائد کر دی حالانکہ اس وقت تک پاکستان امریکہ کے ساتھ علاقے کے دو دفاعی معاہدوں سنٹو اور سیٹو میں اس کا اتحادی تھا۔

## معاہدہ تاشقند:

سترہ روزہ جنگ کے بعد سلامتی کونسل کے کہنے پر جنگ بندی ہو گئی اور سابق سویت یونین کی دعوت پر بھارت اور پاکستان روس میں تاشقند کے مقام پر بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تاشقند میں ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاشتری کے درمیان صلح کے معاہدے پر دستخط ہوئے جسے معاہدہ تاشقند کہا جاتا ہے۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد پہلی ہی رات تاشقند میں بھارتی وزیر اعظم دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو' جو اس موقع پر تاشقند گئے تھے واپسی پر معاہدہ تاشقند کے بعض مندرجات سے اختلاف کرتے ہوئے وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ انھیں خاص طور پر ایوب خان کے اس فیصلے سے اختلاف تھا جس کے تحت انھوں نے کشمیر کے متنازعہ علاقے میں ان علاقوں سے واپسی منظور کر لی تھی۔ جن پر پاکستان افواج نے قبضہ کیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ جنگ بندی لائن جسے افواج نے عبور کیا تھا بین الاقوامی سرحد نہیں ہے لھذا نئی جنگ بندی لائن وہ ہونی چاہیے جہاں جنگ بندی ہوئی ہے۔

پاکستانی عوام نے معاہدہ تاشقند پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ خصوصا" نوجوان طلبہ اس معاہدے سے ناخوش تھے کیونکہ جنگ کے دوران ملک میں یہ تاثر کامیابی سے پیدا کیا گیا تھا کہ پاکستان کو جنگ میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ اس تاثر کی وجہ سے عوام نے جنگ کے نتیجے سے بہت سی خوش کن توقعات وابستہ کر لی تھی کہ اس نے سترہ دن تک اپنے محدود وسائل کے باوجود کئی گنا بڑے دشمن کو کامیابی سے روکے رکھا اور اسے کوئی فیصلہ کن کامیابی حاصل نہیں کرنے دی۔

## ایوب خان کے خلاف تحریک جمہوریت:

## ایوب خان کے خلاف تحریک جمہوریت:

1966ء کے ابتدائی ایام میں طلبہ کی طرف سے معاہدہ تاشقند کے خلاف ایک غیر منظم احتجاجی تحریک جاری تھی کہ بھٹو کے استعفیٰ کے بعد طلبہ کو معاہدہ تاشقند اور بھارت دشمنی کے حوالے سے ایک نوجوان ہیرو دستیاب ہو گیا اور نوجوانوں میں ان کی پذیرائی ہونے لگی۔ اسی اثناء میں لاہور اور کراچی کچھ دانشور ملک کی غیر جمہوری فضا' عوام کو نظر انداز کیے جانے' مزدوروں اور کسانوں کا استحصال اور ملکی وسائل پر چند سرمایہ دار اور جاگیردار خاندانوں کی اجارہ داری کی پالیسیوں سے نجات حاصل کرنے کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ ان افراد میں وزارت خارجہ سے ریٹائر ہونے والے جے۔ اے رحیم (کراچی) نوجوان ترقی پسند لیڈر معراج محمد خان (کراچی) رسول بخش تالپور (کراچی) ڈاکٹر مبشر حسن (لاہور) ملک اسلم حیات ایڈوکیٹ (لاہور) محمد حنیف رامے (لاہور) اور لاہور کے کچھ سینئر پیشہ ور اخبار نویس اور اساتذہ شامل تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے وزارت خارجہ سے استعفیٰ کے بعد ان افراد نے جے۔ اے رحیم کے ذریعے ان سے رابطہ کیا اور ملکی مسائل کے حل کے لیے ایک نئی انقلابی جماعت بنانے کا مشورہ دیا۔ نئی جماعت بنانے کے فیصلہ کے بعد 31 اکتوبر اور یکم نومبر کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ پر ایک کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کیا گیا جس کا چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کو منتخب کیا گیا۔ پارٹی کے سیکریٹری جنرل کا عہدہ جے اے رحیم کو دیا گیا۔ اس کنونشن میں کل 29 افراد نے شرکت کی تھی جو پارٹی کے بنیادی ارکان قرار پائے۔

اس عرصے میں طلبہ کی احتجاجی تحریک ایک سے دوسرے شہر تک پھیل رہی تھی' جس میں ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت کے بعد تیزی آ گئی تھی اور دیگر سیاسی جماعتوں نے بھی پاکستان جمہوری تحریک (پی ڈی ایم) کے نام سے اتحاد قائم کر کے ایوب آمریت کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی 1968ء تک یہ تحریک سابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں پھیل چکی تھی اور اس میں طلبہ' سیاسی کارکن' مزدور تنظیمیں' کسان' سرکاری ملازموں کی تنظیمیں' غرض معاشرے کے ہر شعبے کے افراد اپنے مطالبات کے حق میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ مشرقی پاکستان اور کراچی میں تحریک میں تشدد کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اور مظاہرین نے سرکاری املاک کو نقصان

پہنچانا شروع کر دیا تھا۔

صدر ایوب نے پی ڈی ایم کو مذاکرات کے لیے گول میز کانفرنس کی دعوت دی جسے قبول کر لیا گیا۔ تاہم مشرقی پاکستان سے مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی اور مغربی پاکستان سے بھٹو کی پیپلز پارٹی نے مذاکرات سے انکار کر دیا۔ گول میز کانفرنس میں شریک جماعتوں کے مطالبے پر شیخ مجیب الرحمٰن کو مقدمہ بغاوت (اگر تلہ سازش کیس) سے رہا کر کے کانفرنس میں شریک کیا گیا۔ تاہم اس وقت تک مولانا بھاشانی اور بھٹو کی مقبولیت کی وجہ سے صورت حال ایسی ہو چکی تھی کہ گول میز کانفرنس نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی اور ایوب خان کو اپنا ہی بنایا ہوا آئین منسوخ کر کے دوبارہ اقتدار فوج کے حوالے کرنا پڑا اور آغا محمد یحیٰی خان ملک کے دوسرے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر برسر اقتدار آ گئے۔

## مارشل لاء 1969ء:

مارشل لاء انتظامیہ نے آتے ہی سیاسی جماعتوں کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور ملک میں پہلی بار بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخاب کا پروگرام پیش کیا گیا۔

مارشل لاء انتظامیہ نے جو مطالبات تسلیم کیے وہ درج ذیل ہیں:

(1) پارلیمانی نظام بحال کرنے کا اعلان کیا گیا۔

(2) مغربی پاکستان کا ون یونٹ ختم کر کے پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے صوبے بحال کر دیے گئے۔

(3) بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آبادی کے تناسب سے تمام صوبوں کو نمائندگی دینے کا اعلان کیا گیا۔

(4) تمام سیاسی مقدمات واپس لے لیے گئے۔

دسمبر 1970ء میں ہونے والے پہلے عام انتخابات میں 63 چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں اور گروپوں نے حصہ لیا جن میں سے اہم جماعتوں میں مسلم لیگ کے تینوں دھڑے، کنونشن، کونسل اور قیوم لیگ شامل تھے، نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ)، پاکستان پیپلز پارٹی، عوامی لیگ، جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان، جماعت اسلامی اور پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی جو عوامی لیگ (نوابزادہ گروپ) جسٹس پارٹی اور نظام اسلام پارٹی کو ملا کر بنائی گئی تھی نے حصہ لیا۔

## انتخابات 1970ء:

طویل انتخابی مہم کے دوران ملکی آبادی سیاسی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ایک حصہ ان جماعتوں اور گروہوں کے ساتھ تھا جو انتخاب میں مذہب کے نام پر حصہ لے رہے تھے اور دوسرا حصہ ان افراد پر مشتمل تھا جو ان جماعتوں کے ساتھ تھا جو قومی اور علاقائی' سیاسی اور اقتصادی مسائل کے پروگراموں کے تحت انتخاب لڑ رہے تھے۔ انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ کی ہمدردیاں نمایاں طور پر مذہب کے نعرے کے تحت انتخاب میں حصہ لینے والوں کے ساتھ تھیں لہٰذا بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ انتخابات میں انھیں جماعتوں کو کامیابی حاصل ہو گی۔ تاہم انتخابات کے نتائج جہاں حصہ لینے والی جماعتوں کے لیے حیران کن تھے وہاں خود انتظامیہ کے لیے بھی غیر متوقع تھے۔ قومی اسمبلی کے نتائج کے مطابق مشرقی پاکستان میں دو کے علاوہ تمام نشستیں عوامی لیگ نے جیت لیں۔ ایک نشست پر پی۔ ڈی۔ پی کے نورالامین کامیاب ہوئے جبکہ چٹاگانگ کے پہاڑی قبائل کی نشست پر راجہ تری دیو رائے بلامقابلہ منتخب ہوئے۔ پنجاب کی 83 نشستوں میں سے 62 پیپلز پارٹی نے جیت لیں۔ سندھ سے پیپلز پارٹی کو 21 اور صوبہ سرحد سے ایک نشست حاصل ہوئی۔ کونسل مسلم لیگ کو سات' کنونشن مسلم لیگ کو دو' جماعت اسلامی کو چار اور جمعیت علماء پاکستان کو تین نشستیں حاصل ہوئیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان سے نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) جمعیت علماء اسلام نے قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔ قیوم مسلم لیگ کے نتائج مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے مقابلے میں بہتر رہے۔ قومی اسمبلی کے نتائج کے چند روز بعد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج حسب توقع مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی' سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کے حق میں رہے۔

## 1970-71ء کا سیاسی بحران:

مارشل لاء انتظامیہ نے جس "لیگل فریم ورک آرڈر" کے تحت انتخابات کروائے تھے اس میں نہ صرف آئندہ کے آئینی خاکے کا اعلان بھی کیا گیا تھا اور ساتھ ہی اس میں یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ قومی اسمبلی کا دستور سازی کے لیے اجلاس شروع ہونے کے نوے دن کے اندر اندر آئین بنانا لازمی ہو گا' ورنہ اسمبلی تحلیل ہو جائے گی۔

انتخابات کے نتائج نے ملک کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا' مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے فقید المثال کامیابی حاصل کی تھی لیکن کسی دوسرے صوبے میں اس کا ایک بھی امیدوار کامیاب نہیں ہوا۔ سندھ اور پنجاب میں شاندار کامیابی حاصل کرنے والی پیپلز پارٹی مشرقی پاکستان میں غیر موجود تھی۔ پیپلز پارٹی ایک نئی جماعت تھی اور انتخابات کے وقت اس کی عمر صرف تین سال تھی اس لیے اسے باقی صوبوں میں کام کرنے کا وقت نہیں ملا۔ عوامی لیگ نے 24 سال تک غیر جمہوری حکومتوں کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال کو انتخابی پروگرام کا حصہ بنایا تھا اور انتخاب مشرقی پاکستان کی محرومیوں کے نعرے پر لڑا تھا۔ یہ نعرہ بنگالیوں کے لیے بہت پرکشش تھا لیکن دیگر صوبوں کو ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ایسے صوبے کے پروگرام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جسے وہ بالکل نہیں جانتے تھے۔ اس لیے عوامی لیگ کا چھ نکاتی پروگرام مغربی پاکستان کے عوام کے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہیں تھا۔ مسلم لیگ قیام پاکستان کے فوراً بعد سیاسی جوڑ توڑ اور محلّاتی سازشوں کا شکار ہو گئی تھی اور عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی۔ 1970ء کے انتخاب کے وقت مسلم لیگ تین دھڑوں میں تقسیم تھی اور ان میں سے کسی بھی دھڑے کو عوامی حمایت میسر نہیں تھی۔ اگرچہ ایوب خان کی حکومت بھی مسلم لیگ ہی کی حکومت کہلاتی تھی تاہم حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان اور ان کے ساتھی مارشل لاء کے ذریعے سے اقتدار پر پہلے ہی قابض تھے اور 1962ء میں انھوں نے مسلم لیگ کا نام اپنی آمریت کو سیاسی رنگ دینے کے لیے استعمال کیا تھا۔

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے تمام حصوں میں اثر و رسوخ رکھنے والی کوئی جماعت موجود نہیں تھی' جس کی وجہ سے مارشل لاء انتظامیہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ علاقائی رسوخ والی جماعتوں کے اختلافات کو اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے استعمال کرے۔ ان حالات میں شکست خوردہ جماعتوں نے بھی عوامی لیگ کی کامیابی کو "پاکستان دشمنی" "بھارت اور ہندوؤں کے تعاون کا نتیجہ" قرار دے کر اپنے خدشات کا اظہار شروع کر دیا۔ پیپلز پارٹی نے جو دوسری بڑی جماعت کے طور پر ابھری تھی خود کو مغربی بازو کا نمائندہ قرار دے کر عوامی لیگ سے اقتدار میں حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پیپلز پارٹی کا موقف یہ تھا۔ کیونکہ آئین پورے ملک کے لیے اور ایک مستقل دستاویز ہوتی ہے اس لیے آئین کسی ایک جماعت کے پروگرام کے مطابق

نمائندہ جماعت کہلانے کا حق تھا۔ چنانچہ قائداعظم نے کانگرس کے اس دعویٰ کو چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو ہے۔ قائداعظم کے قول کی تصدیق 1945-46ء کے موسم سرما میں ہونے والے مرکزی اور صوبائی انتخابات کے نتائج نے بھی کر دی۔ مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی تمام مسلم نشستیں بھاری اکثریت سے جیت لیں اور صوبوں میں مسلمانوں کی مخصوص نشستوں کی قریباً 90 فی صد نشستیں حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندگی صرف اور صرف مسلم لیگ ہی کرتی ہے۔

مارچ 1946ء میں برطانوی کابینہ کے تین وزرا پر مشتمل ایک وفد جسے کیبنٹ مشن کہتے ہیں' ہندوستان آیا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کے ساتھ بات چیت کے بعد وفد نے اپنا منصوبہ دونوں سیاسی جماعتوں کو پیش کیا اور کہا کہ یا تو اسے مکمل طور پر قبول کر لیں یا پھر اسے مسترد کر دیں۔ مذکورہ منصوبے میں مزید درج تھا کہ جو سیاسی جماعت اسے کلی طور پر قبول کرے گی' اسے عارضی حکومت بنانے کی پیش کش کی جائے گی جب تک کہ تمام سیاسی جماعتوں کے لیے قابل قبول آئین نہ بن جائے۔ مسلم لیگ نے اس منصوبے کو قبول کر لیا مگر کانگرس نے اسے مسترد کر دیا۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس صورت میں مسلم لیگ کو حکومت بنانے کی دعوت دی جاتی مگر وائسرائے نے کانگرس سے ساز باز کر کے کانگرس کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ یہ صریحاً بے اصولی اور جانبداری تھی لہٰذا مسلم لیگ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور وزارتی وفد کے منصوبے کو مسترد کر دیا۔ بعد میں وائسرائے ویول کی درخواست پر اور مسلمانانِ ہند کے مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلم لیگ نے بھی عبوری حکومت میں شمولیت کر لی مگر آزادی کا مسئلہ بدستور تعطّل کا شکار رہا۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد برطانیہ میں لارڈ اٹیلی کے زیر قیادت لیبر پارٹی برسراقتدار آئی۔ لیبر پارٹی اور کانگرس کے مابین دوستانہ مراسم پہلے سے تھے' کیونکہ لیبر پارٹی' کانگرس کی ہم خیال تھی اور ہندوستان کی تقسیم کی مخالف تھی۔ مگر 1945-46ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شاندار کامیابی کے پیش نظر لیبر پارٹی بھی تقسیمِ برصغیر پر راضی ہو گئی۔ ان حالات میں ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن 22 رمارچ 1947ء کو ہندوستان پہنچے۔ ہندوستان پہنچتے ہی انہوں نے سب سے پہلے کانگرسی لیڈروں سے تبادلہ خیالات کیا اور بعد میں قائداعظم سے ملاقات کی۔

لارڈ اٹیلی نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ جون 1948ء تک بہر صورت اقتدار ہندوستان کو منتقل کر دینا چاہتی ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سیاسی تعطّل کا جو حل پیش کیا وہ کانگرس کے لیے تو بہت سود مند ثابت ہوا مگر اس سے مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وائسرائے کی تقرری سے پیشتر ہی ماؤنٹ بیٹن کے نہرو خاندان سے گہرے تعلقات تھے جب کہ اس کے برعکس قائداعظم کو اس لیے بھی ناپسند کرتے تھے کہ وہ کانگرس اور انگریزوں کی چالوں اور حیلہ سازیوں کے باوجود مطالبہ پاکستان کے بارے میں اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ قائداعظم نے اپنی ولولہ انگیز قیادت سے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح مضبوط بنا دیا تھا' یہاں تک کہ برصغیر کے کروڑوں مسلمان پاکستان کے حصول کے لیے ہر ایثار و قربانی کے لیے تیار تھے۔ چنانچہ ان حالات میں وائسرائے نے 3 رجون 1947ء کو ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا۔ ایک تحقیق کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے اس منصوبے کی منظوری خفیہ طور پر پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں سے پہلے ہی سے حاصل کر لی تھی' جب کہ مسلمان زعما کو اس سلسلے میں بے خبر رکھا گیا۔

اس منصوبے کے اہم نکات درج ذیل ہیں :

1- متحدہ ہندوستان کو دو حصوں میں (پاکستان اور بھارت) میں تقسیم کر دیا جائے۔
2- صوبہ پنجاب اور صوبہ بنگال کے صوبوں کی اسمبلیوں کے مسلمان اور ہندو اراکین کے الگ الگ اجلاس ہوں گے اور اگر انھوں نے تقسیم کا فیصلہ کیا تو ان صوبوں کو تقسیم کر دیا جائے۔
3- سندھ اسمبلی کے اراکین فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا بھارت میں۔
4- صوبہ سرحد میں استصوابِ رائے سے فیصلہ کیا جائے گا کہ یہ صوبہ پاکستان میں شامل ہو یا بھارت میں۔
5- آسام کے مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کے مستقبل کا فیصلہ بھی استصوابِ رائے سے ہوگا۔

-6 بلوچستان کے شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین کو بھی حق دیا جائے گا کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کس کے ساتھ شمولیت چاہتے ہیں۔

-7 اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو تو سرحدوں کے تعین کے لیے باؤنڈری کمیشن مقرر کیے جائیں۔

-8 شاہی ریاستیں Princely States کیبنٹ مشن پلان (1946ء) کے اعلان کے مطابق اپنے مخصوص حالات اور جغرافیائی حیثیت کی روشنی میں کسی ایک مملکت میں شمولیت کا فیصلہ کریں گی۔

-9 حکومت برطانیہ جون 1948ء سے بھی پہلے اقتدار ہندوستانیوں کو دینا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں وائسرائے نے اعلان کیا کہ اقتدار 15 راگست 1947ء تک منتقل کر دیا جائے گا۔

اگرچہ ماؤنٹ بیٹن کے اس منصوبے کی وجہ سے پاکستان کو سخت نقصان پہنچا پھر بھی یہ مسلم لیگ کی فتح تھی کہ حکومت برطانیہ نے متحدہ ہندوستان کی تقسیم کا اصول مان لیا۔ مسلم لیگ کی طرف سے 9 رجون 1947ء کو منظور کی گئی ایک قرارداد میں کہا گیا کہ اگرچہ مسلم لیگ کی کونسل پنجاب اور بنگال کی تقسیم اصولی طور پر قبول نہیں کرتی' تاہم وہ اس منصوبے کے بنیادی اصولوں کو مصالحت کے طور پر قبول کرتی ہے۔

3 رجون 1947ء کے منصوبے کی رو سے صوبہ سرحد اور ضلع سلہٹ میں استصواب رائے نیز بلوچستان میں شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپلٹی کی مطلوبہ رائے مسلم لیگ کے لیے ایک چیلنج تھا۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے اس چیلنج کو قبول کیا جس سے وہ بطریق احسن سرخرو ہوئے۔ ان علاقوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دے کر پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

18 رجولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیم ہند کو منظور کر کے اسے قانون بنا دیا جو قانون آزادی ہند 1947ء کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے 15 راگست 1947ء کو پاکستان اور بھارت میں آزاد مملکتیں قائم کرنا قرار پائیں جنھیں نو آبادیاتی درجہ حاصل ہوگا' نیز برطانوی ہند پر برطانوی راج ختم ہو جائے گا۔

قانون آزادی ہند 1947ء کی اہم دفعات کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے :

1- برطانوی ہند کو دو آزاد ریاستوں (Sovereign States) میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

2- ان دونوں ممالک کے کسی حصے اور کسی معاملے پر برطانوی حکومت کی عمل داری نہیں رہے گی۔ دونوں ممالک کے قانون ساز اداروں کو اپنے اپنے ملک میں قانون سازی کے مکمل اور جامع اختیارات ہوں گے۔

3- جب تک دونوں ممالک کے اپنے آئین تشکیل نہیں پاتے، حکومت کا نظام حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء ایکٹ کے تحت چلایا جائے گا۔ اس میں قانون آزادی ہند 1947ء کی روشنی میں ضروری ترامیم کی جا سکیں گی۔

4- 31 رمارچ 1948ء تک ہر دو ممالک کے اپنے اپنے گورنر جنرل کو اپنے اپنے ملک میں ضروری ترامیم کا حق حاصل رہے گا۔ اس کے بعد دونوں ممالک کی مقننہ جات بھی اس کو جاری رکھنے یا اس میں ترمیم کا حق رکھیں گی۔ (یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان کی کسی مقننہ یا عہدے دار کو حکومت ہند کے قانون مجریہ 1935ء میں ترمیم کا حق حاصل نہیں تھا۔ صرف برطانوی پارلیمنٹ ہی ایسا کر سکتی تھی)۔

5- تاج برطانیہ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ بھارت یا پاکستان کی مقننہ جات کے منظور کردہ قوانین کو نامنظور کر دے۔ یہ اختیار صرف متعلقہ گورنر جنرل کو حاصل ہوگا۔

6- حکومت برطانیہ اور شاہی ریاستوں (Princely States) کے حکمرانوں کے درمیان کیے گئے معاہدے منسوخ ہو جائیں گے۔ اب یہ ریاستیں اپنے تعلقات متعلقہ مملکت سے گفت و شنید سے طے کریں گی۔

7- برطانیہ کے بادشاہ کے خطابات سے "شہنشاہ ہند" کا خطاب ختم کر دیا گیا۔

اس قانون کے تحت قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے پہلے گورنر جنرل بنے۔

**ریڈ کلف ایوارڈ اور اس کی ناانصافی :** 3رجون 1947ء کے منصوبے کے تحت پنجاب اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں نے ان صوبوں کی تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا، لہٰذا وائسرائے نے بنگال اور پنجاب کے لیے دو باؤنڈری کمیشن 30 رجون 1947ء کو مقرر کیے۔ ان دونوں کمیشنوں کا مشترکہ

صدر سر سیرل ریڈ کلف ایک برطانوی وکیل مقرر کیا گیا۔

دونوں مملکتوں کے مابین حد بندی کا کام نہایت اہم اور نازک نوعیت کا تھا' اس لیے قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ یہ کام اقوام متحدہ کی نگرانی میں کسی غیر جانبدار ادارے کے سپرد ہونا چاہیے لیکن کانگرس نے اسے منظور نہ کیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے یہ تجویز پیش کی کہ برطانیہ کی پریوی کونسل (Privy Council) کے ججوں کے ذریعے حد بندی کا کام کروایا جائے' لیکن اس بار ماؤنٹ بیٹن نے کانگرس کا کردار ادا کیا اور اس تجویز سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اسے نامنظور کر دیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 3 رجون 947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے منصوبے کا اعلان کرتے وقت پاکستان کی جو جغرافیائی حدود بیان کی تھیں' ان کی رو سے تکمل آسام کے علاوہ مشرقی پنجاب کے اضلاع گورداسپور' فیروزپور اور جالندھر کے مسلم اکثریت والے علاقوں کی پاکستان میں شمولیت کا ہر ممکن امکان تھا' مگر ریڈ کلف نے حد بندی کے کام میں انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صریحاً جانبداری سے کام لیا اور پاکستان کو بعض انتہائی اہم علاقوں سے محروم کر دیا۔ یہ فیصلہ ریڈ کلف ایوارڈ کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے پاکستان کے لیے ایسے مسائل پیدا ہو گئے جو آج تک اس کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

پنجاب کی حدبندی میں ریڈ کلف نے مسلم اکثریت کی تحصیلیں' گورداسپور' بٹالہ' فیروزپور اور زیرہ بھارت میں شامل کر دیں۔ اسی طرح ایک انتہائی گہری سازش کے تحت ریاست جموں و کشمیر کو بعد میں بھارت سے ملانے کے لیے گورداسپور کے ذریعے راستہ مہیا کیا گیا اور یوں کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضہ کی راہ ہموار کی گئی۔ مغربی پنجاب کی کئی نہروں کے ہیڈورکس بھارت کو دے دیے گئے اور یوں نہری پانی کا مسئلہ پیدا کیا گیا۔ بنگال کی حد بندی کے ایوارڈ میں کلکتہ کا شہر اور بندرگاہ' ضلع مرشد آباد اور ندیہ کے علاقے بھارت میں شامل کر دیے۔

ریڈ کلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "یہ ایوارڈ غیر منصفانہ' ناقابلِ فہم بلکہ غیر معقول ہے۔ چونکہ میں اس پر عمل کرنے کا عہد کر چکا ہوں' اس لیے یہ ہم پر لازم ہے"۔

# پاکستان کے ابتدائی مسائل

**انتظامی امور :** بھارت نے شروع ہی سے پاکستان کے لیے لاتعداد مسائل کھڑے کر دیے۔ پاکستان کے پاس شروع شروع میں وسائل کی بہت کمی تھی' یہاں تک کہ روز مرہ کے عام سرکاری کام چلانے میں بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ انتہائی محدود وسائل کے باوجود قوم میں جذبہ تعمیر کی کمی نہ تھی۔ پاکستانی قوم احساسِ محرومی اور کمتری کا شکار نہیں ہوئی بلکہ وہ قومی جذبے سے سرشار تعمیر وطن کے لیے تیار ہو گئی۔ کیوں نہ ہوتی! ان کے قائد کی مثال اور اس کی رہنمائی ان کی ہمسفر تھی۔

کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ مرکزی حکومت کے کئی دفاتر مناسب سرکاری عمارات نہ ہونے کی وجہ سے بیرکوں میں قائم کیے گئے۔ بعض ریل گاڑیوں پر جن میں پاکستان کے حصّے کا ضروری دفتری ریکارڈ اور سرکاری ملازم دہلی سے پاکستان آ رہے تھے' سفر کے دوران میں ان پر ہندوؤں کی جانب سے حملے ہوئے جس سے بیش قیمت سرکاری ریکارڈ اور ان گنت قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ ایسے دل گداز حالات میں بھی پاکستانی عوام اور سرکاری ملازمین مایوس نہ ہوئے بلکہ زیادہ تندہی سے ملکی کاموں میں حصہ لینے لگے۔

**مہاجرین کا مسئلہ :** تقسیمِ برصغیر ہند کے بعد ہندوؤں اور سکھوں نے ایک باقاعدہ سکیم کے تحت پورے بھارت میں بالعموم اور مشرقی پنجاب میں بالخصوص مسلمانوں کے استحصال کی مہم شروع کی جس کے نتیجے میں انسانیت دشمن ہندوؤں اور سکھوں نے ہزاروں بلکہ لاکھوں عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور جوانوں کو انتہائی بے دردی و سنگدلی سے قتل کیا اور بے آبرو کیا۔ روزانہ لاکھوں تباہ حال' فاقہ زدہ زخمی مہاجرین بھارت سے پاکستان پہنچ رہے تھے۔ مسلمان مہاجرین کے ان قافلوں کے لیے قیام' خوراک' طبی امداد' تعلیم' روزگار اور مستقل آباد کاری کا انتظام ضروری تھا لیکن اس کے لیے بے پناہ وسائل کی ضرورت تھی' جن سے نوزائیدہ مملکت محروم تھی۔ مہاجرین کے عارضی قیام کے لیے جو کیمپ لگائے گئے۔ وہ بھی بہت ناکافی ثابت ہوئے۔ نتیجتاً مہاجرین نے مجبوراً سڑکوں کے کنارے' درختوں کے نیچے اور فٹ پاتھوں پر پناہ لی۔ پاکستان کی انتظامیہ کے

لیے مہاجرین کا مسئلہ ایک چیلنج سے کم نہ تھا مگر حکومت اور عوام نے مل کر اسے حل کیا۔ تاریخِ عالم شاہد ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں کبھی بھی کسی قوم کے لوگوں کا کسی ملک سے اخراج نہیں ہوا، جتنی تعداد میں بھارت سے مسلم مہاجرین پاکستان میں آ کر آباد ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق 1948ء تک سوا کروڑ مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے اور ان کی تعداد بتدریج بڑھتی رہی۔

پاکستان میں آنے کے بعد اگر مہاجرین حوصلہ ہار دیتے اور مایوسی کا شکار ہو جاتے یا اہل پاکستان خود غرضی کا مظاہرہ کرتے یا حکومت پاکستان کے عزم میں کوئی فرق آ جاتا تو مملکت پاکستان کے لیے مزید مشکلات کے دروازے کھل سکتے تھے، مگر ایسا ممکن نہ تھا کیونکہ پاکستان کے عوام اور نو وارد مہاجرین قائداعظم کی رہنمائی اور قیادت میں نیا عزم لیے ہوئے تھے۔

**اثاثوں کی تقسیم:** تقسیم ہند کے وقت طے پایا تھا کہ برطانوی ہند کے اثاثوں کی تقسیم بھی پاکستان اور بھارت کے مابین ہو گی، مگر کانگرس اور ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے بہت ہی کم سامان پاکستان پہنچایا گیا۔ متحدہ ہندوستان کا 4 ارب روپے کا محفوظ سرمایہ تھا۔ معاہدے کے مطابق اس میں سے ایک چوتھائی یعنی ایک ارب روپیہ پاکستان کے حصے میں آنا تھا لیکن بھارت نے صرف بیس کروڑ روپے دیے اور مزید رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے برعکس متحدہ ہندوستان کے قرضہ جات کا 20 فی صد پاکستان کے ذمے ڈال دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ اثاثہ جات کی رقوم کو روک کر کشمیر کے مسئلہ پر پاکستان پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ نومبر 1947ء میں اس سلسلے میں پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے مابین دہلی میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ قومی قرضوں میں پاکستان کا حصہ $17\frac{1}{2}$ فی صد ہو گا۔ دسمبر 1947ء میں دونوں حکومتوں نے اس معاہدے کی توثیق کر دی مگر اس کے باوجود بھی ہندوستان کی حکومت نے بقایا رقم دینے سے انکار کر دیا۔

**افواج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم:** تقسیم ہند کے وقت افواج اور فوجی اثاثوں کی تقسیم کا مسئلہ بڑا حساس اور نازک تھا۔ انگریز کمانڈر انچیف افواج کی تقسیم کے خلاف تھا مگر قائداعظم کی دلیل یہ تھی کہ ایک ملک کی اپنی خود مختار فوج ہونی چاہیے کیونکہ فوج کا کام نہ صرف ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہوتا ہے بلکہ اسے ملک کی تعمیر میں بھی حصہ لینا ہوتا ہے۔ تقسیم افواج کے لیے ایک سات [illegible] جس کا سربراہ کمانڈر انچیف تھا۔ یہ طے پایا کہ افواج کی تقسیم کا کام یکم

اپریل 1948ء تک مکمل ہو جانا چاہیے۔

افواج کی تقسیم کے ساتھ ہی یہ طے پایا تھا کہ متحدہ ہندوستان کے فوجی ساز و سامان کا ایک تہائی حکومت پاکستان کو ملے گا۔ تقسیم ہند کے وقت اسلحہ بنانے والی قریباً" تمام فیکٹریاں بھارتی علاقے میں تھیں۔ نیز فوجی ذخائر کے ڈپو بھی ان علاقوں میں تھے' جو بھارت میں شامل ہوئے۔ ایک سازش کے تحت بھارتی حکومت نے اسلحہ ساز فیکٹریوں کو پاکستان منتقل کرنے سے انکار کر دیا اور ڈپوؤں میں موجود اسلحے کو پاکستان بھیجنے کا کام التوا میں ڈال دیا تاکہ جہاں تک ممکن ہو پاکستان کو اس کے جائز فوجی اثاثوں سے بھی محروم کر دیا جائے۔

بھارت نے افواج کے بھیجنے اور فوجی اثاثوں کی تقسیم پر ایسے ایسے روڑے اٹکائے کہ انگریز کمانڈر انچیف نے نہرو حکومت کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر استعفیٰ دے دیا۔ اس سے افواج کی تقسیم کے کام میں پاکستان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کمانڈر انچیف نے برطانوی حکومت کو اپنی ایک خفیہ رپورٹ میں لکھا کہ نہرو حکومت یہ مصمّم ارادہ کر چکی ہے کہ جہاں تک ہو سکے' وہ پاکستان کو مضبوط بنیادوں پر قائم ہونے سے دور رکھے گی۔

**نہری پانی کا مسئلہ :** پنجاب کی غیر منصفانہ اور غلط طریقے سے تقسیم کے نتیجے میں نہری پانی کا مسئلہ پیدا ہوا۔ ریڈ کلف نے حد بندی کے فیصلے میں دریائے راوی پر مادھو پور کا ہیڈ ورکس اور دریائے ستلج پر فیروز پور کا ہیڈ ورکس بھارت کو دے دیے' جب کہ یہاں سے نکلنے والی نہریں پاکستان میں واقع ہیں اور وسیع پاکستانی علاقے کے لیے آبپاشی کا ذریعہ ہیں۔ یکم اپریل 1948ء کو بھارت نے ان ہیڈ ورکس سے پاکستانی نہروں کا پانی بغیر پیشگی اطلاع کے بند کر دیا۔ اس فعل سے بھارت کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان نہروں سے سیراب ہونے والی پنجاب کی زرعی زمین بے آب و گیاہ صحراؤں میں تبدیل ہو جائے اور پاکستان کی معیشت کو نقصان پہنچے۔ اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے مشرقی دریاؤں یعنی راوی' بیاس اور ستلج پر ملکیت کا دعویٰ کیا۔ بھارت کا یہ دعویٰ بین الاقوامی قانون کے خلاف تھا چنانچہ پاکستان نے اقوام متحدہ سے رجوع کیا۔ عالمی بینک نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ طویل مذاکرات کے بعد 1960ء میں سندھ طاس کا معاہدہ طے پایا جس کی توثیق دونوں حکومتوں نے 1961ء میں کر دی۔ اس معاہدے کے مطابق یہ طے پایا کہ تین مشرقی دریاؤں (ستلج' بیاس' راوی) کے استعمال کا حق بھارت کو حاصل

ہو گا اور تین مغربی دریا (چناب، جہلم اور سندھ) پاکستان کے حوالے کر دیے گئے۔ اس معاہدے پر عمل در آمد کے بعد نہری پانی کا مسئلہ اب بہت حد تک حل ہو گیا ہے۔

**ریاستوں کے الحاق کا مسئلہ :** قانون آزادی ہند 1947ء میں حکومت برطانیہ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ تقسیم ہند کے بعد برطانوی اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہو جائے گا لہٰذا 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کے مطابق والیانِ ریاست کو مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنی جغرافیائی حیثیت اور رعایا کی خواہشات کے مطابق پاکستان یا بھارت جس کے ساتھ وہ چاہیں، شامل ہو سکتے ہیں چنانچہ بہاولپور، لس بیلہ، مکران، قلات اور صوبہ سرحد کی ریاستیں پاکستان میں شامل ہو گئیں ان کے علاوہ جوناگڑھ، مناوادر اور منگرول نے بھی پاکستان میں شامل ہونے کا اعلان کیا مگر بھارت نے زبردستی ان پر قبضہ کر لیا۔ تقسیم ہند کے وقت ان تینوں ریاستوں کے مسلم حکمرانوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا، کیونکہ ان ریاستوں کا پاکستان سے سمندر کے راستے آزادانہ رابطہ قائم ہو سکتا تھا۔ بھارتی حکومت نے ان کے الحاق پر حکومت پاکستان سے احتجاج کیا مگر قائداعظم نے کہا کہ یہ ریاستیں پاکستان کے ساتھ الحاق کے بعد اب پاکستان کا حصہ بن چکی ہیں۔ ان ریاستوں پر بھارت کی طرف سے دباؤ ڈالنے کا مطلب پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہو گا۔ قائداعظم کی قیادت میں بھارت کو ان ریاستوں پر غاصبانہ قبضہ کی جرأت نہ ہوئی، لیکن ان کی وفات کے بعد نومبر 1948ء میں بیس ہزار بھارتی فوج جوناگڑھ میں داخل ہو گئی اور ریاست پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ جوناگڑھ کے حکمران نے بھاگ کر کراچی میں پناہ لی۔ بھارت نے یہ کہہ کر اس ریاست پر قبضہ کر لیا کہ وہاں کے عوام بھارت سے الحاق چاہتے تھے، لیکن یہ اصول بھارت نے مشرقی پنجاب کی ریاست نابھا اور کشمیر میں تسلیم نہیں کیا۔ نابھا کی 64 فی صد آبادی مسلم تھی اور جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کی سرحد کے ساتھ ملی ہوئی تھی نیز وہاں کے مسلم عوام بھی پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے تھے، لیکن بھارتی حکومت نے نابھا کے راجا کو پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے سے باز رکھا۔

ریاست جموّں و کشمیر برصغیر کی تمام شاہی ریاستوں میں سے ایک نہایت ہی اہم ریاست تھی جس کی قریباً ایک ہزار کلومیٹر لمبی سرحد پاکستان کے ساتھ ملتی ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی چالیس لاکھ تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی 96 فیصد ا،، جمّ

میں مسلمانوں کی آبادی 70 فیصد تھی۔ نسل، تمدّن، خوراک، رسم و رواج اور لباس کے اعتبار سے ریاست کشمیر کے مسلمان، پاکستان کے مسلمانوں کے بہت قریب ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیر کے سب دریا بہہ کر پاکستان میں آتے ہیں۔ ریاست کے تینوں راستے (1) سرینگر جموں، سیالکوٹ (2) سرینگر ایبٹ آباد اور (3) سرینگر راولپنڈی، پاکستان آتے ہیں۔ ان کے علاوہ 1947ء میں ریاست جموں و کشمیر کا بیرونی دنیا سے بذریعہ سڑک کوئی راستہ نہ تھا مگر کانگرس، ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کے گٹھ جوڑ نے انتہائی دھاندلی سے کام لیتے ہوئے، گورداسپور کا علاقہ بھارت میں شامل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھارت کو براستہ کٹھوعہ جموں تک راستہ مہیا کر دیا گیا جس سے کشمیر پر بھارت کے غاصبانہ قبضے کی سازش اور انتظامات مکمل ہو گئے۔ اندریں حالات وہاں کے ہندو راجا نے بھارت کے ساتھ الحاق کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مہاراجہ نے ریاست کی فوج اور پولیس میں سے تمام مسلمان ملازمین کو برخاست کر کے ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔ حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہوا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے خلاف پونچھ کے مسلم مجاہدین نے اپنی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھائے۔ مظلوم مسلمانوں کو مہاراجہ کی طرف سے یہ کہا گیا کہ وہ کیمپوں میں جمع ہو جائیں تاکہ انھیں بحفاظت سیالکوٹ پہنچا دیا جائے۔ اس طرح دھوکہ دے کر نہتے مسلمانوں کو کیمپوں میں جمع کر کے ان کا قتلِ عام کیا گیا۔ اس قتلِ عام کی خبر سن کر بہت سے قبائلی اور پاکستان سے بہت سے رضاکار اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے ریاست میں داخل ہوئے اور تیزی سے سرینگر کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ 24 اکتوبر 1947ء کو آزاد کشمیر حکومت کا اعلان کیا گیا۔ مہاراجہ بھاگ کر جموّں پہنچا اور طے شدہ سازش کے تحت بھارت سے فوجی امداد طلب کی۔ مہاراجہ کی بھارت میں زبانی شمولیت پر بھارتی حکومت نے ریاست جموّں و کشمیر میں اپنی باقاعدہ فضائیہ اور بری افواج بڑی تعداد میں داخل کر دیں۔

قیامِ پاکستان کے وقت مہاراجہ نے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے تک پاکستان کے ساتھ ایک معاہدہ جاریہ یعنی (حالات جوں کے توں رکھنے کا معاہدہ (Agreement of Status Quo)) کیا تھا لہٰذا قائداعظم نے اعلان کیا کہ اس نام نہاد الحاق کو درج ذیل وجوہات کی بنا پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا:

1- بھارت کے ساتھ ریاست جموّں و کشمیر کا نام نہاد الحاق عوام کی خواہشات کے منافی ہے۔
2- معاہدہ جاریہ کی موجودگی میں مہاراجہ یک طرفہ طور پر حالات کی تبدیلی کا مجاز نہیں۔
3- جس وقت مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ الحاق کی پیشکش کی' اس وقت ریاست کے ایک بڑے حصے پر اس کا اقتدار ختم ہو چکا تھا۔

اس موقع پر پاکستان نے براہِ راست بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ یکم نومبر 1947ء کو قائداعظم نے اس سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن سے گفت و شنید کی لیکن پنڈت نہرو نے مخالفت کی۔

جب بھارتی فوج قوت سے ریاست پر قبضہ کرنے میں ناکام رہی تو یکم جنوری 1948ء کو بھارتی حکومت نے مسئلہ کشمیر' سلامتی کونسل میں پیش کیا اور کہا کہ ریاست میں امن و امان بحال ہونے پر وہ کشمیری عوام کی خواہشات معلوم کرنے کے لیے غیر جانبدارانہ طور پر رائے شماری کروائے گا۔

کشمیر کے مسئلے کے حل کی غرض سے سلامتی کونسل نے 12 راگست 1948ء اور 5 رجنوری 1949ء کو دو قراردادیں منظور کیں جن کو پاکستان اور بھارت کی حکومتوں نے بھی تسلیم کیا۔ ان کا لبِ لباب یہ ہے:

1- جنگ فوری طور پر بند کرا دی جائے اور اقوام متحدہ کے کمیشن کی نگرانی میں آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے درمیان جنگ بندی لائن کھینچ دی جائے۔
2- دونوں حکومتیں کشمیر سے اپنی اپنی فوجیں ہٹا لیں۔
3- اقوام متحدہ کی نگرانی میں استصوابِ رائے کا انتظام کیا جائے۔

سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق جنگ بندی تو ہو گئی لیکن ریاست میں استصواب رائے کی نوبت آج تک نہ آ سکی۔ آج تک کشمیر کا مسئلہ دونوں مملکتوں کی راہ میں کشیدگی کا سبب بنا ہوا ہے۔ 1949ء سے 1953ء کے عرصہ میں اقوام متحدہ کی طرف سے کئی ناظمِ رائے شماری مقرر ہو کر آئے۔ پاکستان نے ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا لیکن بھارت نے کسی نہ کسی

حیلے ان کی تجاویز کو رد کر دیا۔ 1957ء میں سلامتی کونسل کی کوشش ایک بار پھر بھارت کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ 1962ء میں راولپنڈی اور 1963ء میں دہلی میں دونوں ملکوں کے وزرائے خارجہ نے اس مسئلے پر مذاکرات کیے۔ 1964ء میں بھی کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔

مسئلہ کشمیر کی وجہ سے دونوں ممالک کی ایک دوسرے کے ساتھ کئی جنگیں بھی ہو چکی ہیں' مگر بدقسمتی سے بھارت کی روایتی سامراجیت کی وجہ سے آج تک یہ مسئلہ دونوں ممالک کے مابین کشیدگی کا باعث ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ نہ صرف پاکستان کی ابتدائی مشکلات اور مسائل بھارت کے پیدا کردہ ہیں بلکہ پاکستان کا ہر مسئلہ بھارت کا پیدا کردہ ہے جب کہ پاکستان نے شروع ہی سے بھارت کے ساتھ اچھے ہمسائیوں جیسے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

## قائداعظم اور استحکامِ پاکستان

تحریکِ قیامِ پاکستان میں قائداعظم محمد علی جناح کا کردار اور ان کی قائدانہ صلاحیتیں اظہر من الشمس ہیں۔ اس تحریک میں قائداعظم کی شخصیت اور ان کی بصیرت ہی نے اتنے مشکل اور کٹھن کام کو آسان بنا دیا اور پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت روئے ارض پر نمودار ہوئی۔

جہاں قیامِ پاکستان کے لیے بے شمار قربانیوں اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت تھی' اس کے قائم رکھنے اور مضبوط بنانے میں بھی سخت محنت اور لگن درکار تھی۔ قائداعظم کی عظیم قیادت نے اس کام کو بہت حد تک آسان بنا دیا۔ انھوں نے قیام پاکستان کے بعد ایک قومی جذبہ بیدار کر دیا جس کے سامنے دنیا کی کوئی بھی مشکل ہیچ تھی۔ قائداعظم نے کوشش کی کہ ابتدا میں تمام مسائل کا اصولی طور پر حل تلاش کر کے ایسا لائحہ عمل بنا لیا جائے جس پر چل کر ملکی ترقی کی راہوں کی نشاندہی آسانی سے ہو سکے' مگر قدرت نے قیام پاکستان کے بعد بہت ہی قلیل عرصے کے لیے ہمارے اس عظیم قائد کی سرپرستی ہمیں عنایت کی۔ قائداعظم کے دور میں جو اہم امور طے ہوئے ان کا اجمالی جائزہ یوں ہے:

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس کراچی میں 11 راگست 1947ء کو ہوا۔ یہ دستور

ساز اسمبلی ان ممبران پر مشتمل تھی جو ان علاقوں سے منتخب ہوئے تھے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہوئے۔ 14 راگست 1947ء کو قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خان کو ملک کا پہلا وزیراعظم مقرر کیا گیا۔ اگرچہ 1935ء کے ایکٹ کے ترمیم شدہ قانون کے مطابق گورنر جنرل کے اختیارات محدود تھے مگر قائداعظم کی عوام میں بے پناہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی بدولت ان کو خود بخود وسیع اختیارات حاصل ہو گئے تھے' چنانچہ کئی دفعہ انھوں نے کابینہ کے اجلاس کی صدارت کی۔ جن اہم امور کی طرف قائداعظم نے فوری و خصوصی توجہ دی اور رہنما اصول بیان کر کے قوم کی رہنمائی کی' ان کا جائزہ درج ذیل ہے۔ قوم نے آپ کی آواز پر لبیک کہا جس کی بدولت نوزائیدہ مملکت نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کر دیں۔

1- مہاجرین کی آباد کاری
2- سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین
3- صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین
4- پاکستان کی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین
5- خارجہ حکمتِ عملی
6- طلبہ کو حصولِ تعلیم کی طرف توجہ دلانا

1- مہاجرین کی آباد کاری: قیام پاکستان کے وقت جو مسائل درپیش تھے' ان میں یہ وہ اہم مسئلہ تھا جس کی طرف قائداعظم نے سب سے زیادہ توجہ دی۔ قائداعظم ریلیف فنڈ قائم کیا گیا۔ عوام اور صاحبِ ثروت لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے مسلمان مہاجر بھائیوں کی زیادہ سے زیادہ مالی امداد کریں۔ اکتوبر 1947ء میں آپ کچھ عرصہ کے لیے لاہور تشریف لے گئے تاکہ وہاں مہاجرین کے آنے والے زبردست سیلاب سے پیدا ہونے والے مسائل کا قریب سے جائزہ لے سکیں اور ان لُٹے پُٹے بے سہارا افراد کی رہائش اور خوراک کا بندوبست کر سکیں۔ 30 راکتوبر 1947ء کو لاہور ہی میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "اب یہ ہم پاکستانیوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لاکھوں تباہ حال مہاجرین جو اپنا سب کچھ بھارت میں چھوڑ کر پاکستان آ رہے ہیں' ان کی ہر ممکن امداد کی جائے' انھیں یہ مصیبتیں اس لیے سہنا پڑیں کہ وہ مسلمان ہیں"۔

آپ نے شہریوں سے بھی اپیل کی کہ وہ نہایت صبر سے کام لیں اور ہر لحاظ سے اپنے مہاجر بھائیوں کی آبادکاری میں حکومت کی مدد کریں۔ آپ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان کے عوام نے بھرپور حصہ لیا۔ ریلیف فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا اور ہر سطح پر مہاجرین کی امداد کی۔

**سرکاری افسران کو رویہ تبدیل کرنے کی تلقین:** قائداعظم نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا کہ قیام پاکستان کے بعد اب سرکاری افسران کا کردار حاکم کا سا نہیں ہونا چاہیے بلکہ وہ عوام کے خادم بن کر رہیں۔ 25 رمارچ 1948ء کو سرکاری افسران سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔ "آپ (سرکاری افسران) کو قوم کے خادم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دینے چاہییں۔ آپ کو کسی سیاسی جماعت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔ کوئی بھی سیاسی جماعت برسراقتدار آ سکتی ہے، مگر آپ کا رویہ عوام سے ایسا ہونا چاہیے کہ ان کو احساس ہو کہ آپ حکمران نہیں، آپ قوم کے خادم ہیں۔ آپ انصاف، ایمانداری اور ثابت قدمی سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اگر آپ میری نصیحت پر عمل پیرا ہوں گے تو مجھے یقین ہے کہ عوام کی نگاہ میں آپ کا مقام اور مرتبہ بلند ہو گا"۔

قائداعظم کے فرمان کا جملہ افسران اور اہل کاروں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور انھوں نے نہایت محنت سے، رات دن ایک کر کے ابتدائی بحران سے پاکستان کو نکالا۔

**3- صوبائی اور نسلی تعصب سے گریز کرنے کی تلقین:** صوبائی اور نسلی خطرے کو بھانپتے ہوئے قائداعظم نے قوم کو بروقت اس کی طرف متوجہ کروایا۔ آپ نے 15 جون 1948ء کو فرمایا۔

"اب ہم پاکستانی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی بلوچی، پٹھان، سندھی، بنگالی اور پنجابی نہیں بلکہ سب پاکستانی ہیں۔ ہماری سوچ اور ہمارا عمل پاکستانی کی حیثیت سے ہونا چاہیے اور ہمیں پاکستانی ہونے پر فخر کرنا چاہیے"۔

آپ نے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ ان کے مسائل پر توجہ دی۔ ان صوبوں کے عوام کو نئی امید دی اور پاکستان سے وابستگی کے جذبات کو تیز کر کے انھیں نئی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا۔ انھوں نے صوبہ سرحد میں وزیرستان ایجنسی سے فوجیں ہٹا دیں۔ اس طرح اس علاقے کے لوگوں کو یہ احساس دلایا گیا کہ یہ بھی پاکستان کا اٹوٹ انگ ہیں۔ انھوں نے ریاستوں اور سرحدی علاقوں کی ایک نئی وزارت قائم کی۔ کراچی کو ملک کا دارالخلافہ بنا دیا۔ ریاستوں کی پاکستان میں

شمولیت کو یقینی بنایا۔ اس میں خاص طور پر مسئلہ ریاستِ قلات کا تھا۔

4۔ پاکستان کی معیشت کے رہنما اصولوں کا تعین: معیشت اور اقتصادیات جیسا اہم مسئلہ بھلا قائداعظم کی نظروں سے کیسے اوجھل رہ سکتا تھا۔ پاکستان کے مستقبل کے مجوّزہ نظام سے متعلق آپ نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر یکم جولائی 1948ء کو فرمایا "مغربی معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاتعداد ناقابلِ حل مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ مغربی طرز کا معاشی نظام ہمارے ملک میں خوش حالی اور ترقی نہیں پیدا کر سکتا' اس لیے ہمیں اپنی بہبود کے لیے کوئی نیا طریقہ وضع کرنا ہو گا اور دنیا کو ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہو گا' جس کی بنیادیں اسلامی مساوات اور معاشرتی انصاف پر مبنی ہوں۔ ایسا کرنے سے ہم مسلمان قوم کی حیثیت سے دنیا کو ایک ایسا معاشی نظام دینے میں کامیاب ہو جائیں گے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے امن کا پیغام بن کر آئے گا۔ یاد رہے کہ امن ہی سے انسانیت کی بقا اور خوش حالی قائم رہ سکتی ہے"۔

اس کے ساتھ ساتھ فوری مسئلہ لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔ دوسری طرف بھارت نے تقسیم کے اصول کے مطابق پاکستان کے حصّے میں آنے والے سرمایہ سے ایک کثیر رقم پاکستان کو ادا نہ کی تھی۔ اس طرح اس نئے ملک کو ابتدا ہی میں شدید مالی بحران سے دوچار ہونا پڑا۔ قائداعظم نے اس مسئلے کو بڑی سنجیدگی سے لیا۔ انھوں نے مہاجرین کے لیے ایک ریلیف فنڈ قائم کیا جس سے صورت حال کسی حد تک سنبھل گئی۔

5۔ خارجہ حکمتِ عملی: قیام پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم نے پاکستان کو اقوامِ متحدہ کا رکن بنانے کی طرف توجہ دی۔ قائداعظم کی ہدایات کے مطابق قیامِ پاکستان سے چند مہینوں کے اندر بہت سے ممالک کے ساتھ پاکستان کے سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔ آپ کی خارجہ پالیسی میں مسلمان ممالک کے مابین اتحاد کا عنصر غالب رہا۔ آپ کی خارجہ پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تمام ممالک سے بالعموم اور ہمسایہ و مسلم ممالک سے بالخصوص برابری کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات قائم ہوں۔

ابتدا ہی میں پاکستان کو خارجی معاملات میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل کا محرک بھارت تھا۔ مسائل کی مختصراً تفصیل یہ ہے۔

نومبر 1947ء میں ریاست جوناگڑھ پر جس نے بنیادی طور پر پاکستان میں شامل ہونے کا

فیصلہ کیا تھا، بھارت نے فوج کشی کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔

کشمیر کے مسلمانوں پر بھارت نے مظالم ڈھانا شروع کر دیے اور ساتھ ہی پاکستانی سرحدوں کے ساتھ اپنی افواج ڈال دیں۔ نتیجے کے طور پر ایک جنگ بھی پاکستان پر تھوپ دی گئی جس کا مجموعی حالات میں پاکستان متحمل نہیں ہو سکتا تھا، مگر ہمارے جری و بہادر جوانوں نے اپنی جواں ہمتی سے دشمن کو شکست دی۔

مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے آپ نے بھارتی حکومت سے مذاکرات شروع کیے اور برطانوی حکومت کے دفتر دولتِ مشترکہ سے مسلسل مراسلت بھی کرتے رہے۔ اس کا مقصد دولت مشترکہ کے دفتر کو مجبور کرنا تھا کہ وہ دونوں مملکتوں میں پائی جانے والی کشیدگی کو کم کرنے اور اس علاقے میں امن و استحکام قائم کرنے کی کوئی تدبیر کرے۔

6- **طلبہ کو حصولِ تعلیم کی طرف توجہ دلانا :** کسی بھی معاشرے میں نوجوانوں کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے، قائداعظم اس سے بخوبی آشنا تھے۔ نوجوان ہی کسی ملک کا مستقبل ہوتے ہیں۔ اسی بات کے پیشِ نظر پشاور میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے نوجوانوں کو تلقین کی کہ وہ اپنی تمام تر توجہ حصولِ تعلیم پر مرکوز کریں۔ قیام پاکستان کے سلسلے میں طلبہ نے جو اہم کردار ادا کیا، قائداعظم نے اس کی تعریف کی اور فرمایا کہ طلبہ کو اب احتجاجی سیاست سے بالکل گریز کرنا ہو گا، اسی میں پاکستان کی بقا اور خوشحالی ہے۔

قائداعظم نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور تدبر کی بدولت مسلمانانِ برصغیر کے لیے نہ صرف ایک علیٰحدہ مسلم ریاست حاصل کی بلکہ اس کو مستحکم کرنے کے لیے کام بھی کیا اور رہنما اصول بھی بیان کیے۔ اب ہم پر لازم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک مملکت خداداد پاکستان کو مستحکم کرنے کے لیے اپنا بھرپور، مثبت اور فعال کردار ادا کرے تاکہ جو خواب مسلمانانِ جنوبی ایشیا نے قائداعظم کی والہانہ قیادت میں دیکھا تھا، صحیح معنوں میں شرمندۂ تعبیر ہو اور یہ قطعۂ زمین حقیقی معنوں میں اسلام کا قلعہ اور اس کی سرزمین ثابت ہو۔

## سوالات

(الف) 1- 1940ء سے قیام پاکستان تک کے برصغیر کے سیاسی حالات کا مختصر جائزہ لیجیے۔

2- پاکستان کے قیام کے بعد ابتدائی مسائل اور ان میں پاکستانی عوام کے کردار کا جائزہ لیجیے۔

3- قائداعظم محمد علی جناح نے استحکام پاکستان کے لیے کیسے رہنمائی کی؟

ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگایئے:

1- پہلی جنگ عظیم نے انگریزوں کے عالمی اقتدار کو کمزور کر دیا تھا۔

2- 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں ____ کے اجلاس میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

(آل انڈیا مسلم لیگ' یونینیسٹ پارٹی' آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس)

3- برطانوی کابینہ کا وزیر سر سٹیفورڈ کرپس ____ میں ہندوستان آیا۔

(6 رجون 1940ء' مارچ 1942ء' 4 رجون 1947ء)

4- 46-1945ء کے موسم سرما میں ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔

5- ____ کو ہندوستان کی تقسیم کا منصوبہ پیش کیا گیا۔

(6 رجون 1940ء' 3 رجون 1947ء' 14 راگست 1947ء)

6- 18جولائی 1947ء کو برطانوی پارلیمنٹ نے منصوبہ تقسیمِ ہند کو منظور کر کے اسے قانون بنا دیا۔

7- تقسیمِ ہند کے وقت پنجاب کی حد بندی میں گورداسپور' بٹالہ' فیروزپور کی تحصیلوں کو ناجائز طور پر بھارت میں شامل کر دیا گیا۔

8- اثاثوں کی تقسیم سے متعلق پاکستان اور بھارت کے نمائندوں کے مابین ____ میں کانفرنس ہوئی۔ (لاہور' دہلی' بمبئی)

9- ____ نے ریاست جموں و کشمیر کی پولیس اور فوج میں سے تمام مسلمان ملازمین کو برخاست کر کے ان سے ہتھیار رکھوا لیے۔

(مہاراجہ کشمیر' بھارتی حکومت' انگریز وائسرائے)

10- قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں اور تدبیر کی بدولت مسلمانانِ برصغیر کے لیے نہ صرف ایک علیحدہ مسلم ریاست حاصل کی بلکہ اس کے استحکام کے لیے بنیادی اصول سمجھائے۔

(ج) مختصر جواب لکھیے:

(i) مسلمانانِ برصغیر کی ایک سیاسی' مذہبی اور ثقافتی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے جن مسلمان زعما نے خاص طور پر خدمات سرانجام دیں' ان میں سے صرف پانچ کے نام لکھیے۔

(ii) متحدہ ہندوستان میں مغربی جمہوریت کے نفاذ کا مطلب مسلمانوں کے لیے کیا ہو سکتا تھا؟

(iii) کیبنٹ مشن کب ہندوستان آیا؟

(iv) تقسیم برصغیر کے وقت برطانیہ میں کون سی پارٹی برسراقتدار تھی؟

(v) تقسیمِ برصغیر کے منصوبہ کے تین اہم نکات لکھیے۔

(vi) قانون آزادی ہند 1947ء کی تین اہم دفعات لکھیے۔

(vii) ریڈ کلف ایوارڈ پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے کیا فرمایا؟

(viii) سندھ طاس کا منصوبہ کیا تھا؟

(ix) 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ریاست جمّوں و کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب کیا تھا؟

3

# مسلمانوں کی جمہوری ریاست کا قیام

پاکستان 14 اگست 1947ء کو ایک نئے ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر معرض وجود میں آیا۔ پاکستان کا قیام جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی ایک طویل جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں ممکن ہوا تھا۔ اس جمہوری جدوجہد کی ابتداء سرسید احمد خان نے 1857ء کی مسلح جدوجہد آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کی تحریک سے کی تھی اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح نے انتھک محنت کی اور ہندو اکثریت کی مخالفت کے باوجود اپنی آئینی لڑائی میں کامیابی حاصل کی اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے حقِ خود ارادیت کا حق تسلیم کرایا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد اگرچہ مملکت کو بہت سی مشکلات کا سامنا تھا تاہم ان کے حل کے ساتھ ساتھ پاکستان کی نئی ریاست کے لیے ایک ایسے جمہوری آئین کی تیاری انتہائی ضروری تھی جو ملک کی مسلمان اکثریت کی روایات اور خواہشات کا آئینہ دار ہو۔ آزادی کے بعد ملک کا کاروبار حکومت ہند کے قانون مجریہ ایکٹ 1935ء اور قانون آزادی ہند 1947ء کے تحت چلایا جا رہا تھا۔ جسے عبوری آئین کے طور پر اختیار کر لیا گیا تھا۔ ملک کے لیے مستقل آئین بنانے کا کام دستور ساز اسمبلی کو سونپا گیا۔ دستور ساز اسمبلی 1946ء کے انتخابات کی بنیاد پر قائم کی گئی۔

پاکستان میں آئین سازی جمہوری روایات کو اپنانے اور ان پر عمل کرنے کی تاریخ خاصی افسوسناک ہے۔ 1956ء میں ملک کا پہلا آئین لاگو کیا گیا جس تک پہنچنے کے لیے ملک کو بہت سے

نشیب و فراز اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں حقِ بالغ رائے دہی کے مطابق پہلے عام انتخابات آزادی کے چوبیس سال بعد منعقد ہوئے اور یہ انتخابات بھی مارشل لاء آرڈر کے تحت ممکن ہوئے جس وقت تک ملک میں دو آئین منسوخ کیے جا چکے تھے اور ملک میں دو بار مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔

آئین سازی کے لیے قائداعظم محمد علی جناحؒ نے اپنی اس تقریر میں ایک خاکہ مہیا کر دیا تھا جو انھوں نے 11 اگست 1947ء کو اسمبلی کا افتتاح کرتے ہوئے بطور اسمبلی کے صدر کے کی تھی۔ قائداعظم نے اپنے خطاب میں سفارش، اقرباء پروری، رشوت خوری، کام چوری، بددیانتی، ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری جیسی لعنتوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ نسلی، لسانی، علاقائی اور مذہبی تعصب کی سختی سے مخالفت کی تھی اور پاکستان کے تمام شہریوں کے لیے مساوی جمہوری اور شہری حقوق کا مژدہ سنایا تھا۔ تاہم ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ آئین بننے سے پہلے ہی 11 ستمبر 1948ء کو انتقال کر گئے۔ قائداعظم کے انتقال کے بعد مسلم لیگ، جس نے آل انڈیا مسلم لیگ کی حیثیت سے قیامِ پاکستان کے لیے شاندار جمہوری جدوجہد کی تھی۔ غیر جمہوری جوڑ توڑ اور سیاسی سازشوں کا شکار ہو کر بطورِ سیاسی جماعت کے منتشر ہو گئی۔

## قراردادِ مقاصد

آئین سازی کے سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر قرار دادِ مقاصد منظور کی گئی جس کا مقصد ملکی آئین کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کرنا تھا۔ اس قرار دادِ کو پاکستان کے تینوں نافذ ہونے والے اور ایک منظور ہونے سے پہلے ختم ہو جانے والے آئین میں بنیادی دستاویز کی حیثیت حاصل ہے۔ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی میں منظور ہونے والی اس دستاویز کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) کائنات پر اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ لہٰذا پاکستان کے عوام حاکمیت کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے مطابق بطور ایک امانت کے استعمال کریں گے۔

(2) جمہوریت، مساوات اور عدل کے اسلامی تصورات ملک میں نافذ کیے جائیں گے۔

(3) پاکستان میں ایسے حالات پیدا کیے جائیں گے کہ مسلمان اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھال سکیں۔

(4) غیر مسلم اقلیتوں کو اپنے مذہب اور عقائد پر عمل کرنے اور اپنی ثقافتوں اور روایات کو ترقی دینے کی مکمل آزادی ہو گی۔ اقلیتوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے جائز حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا جائے گا۔

(5) ملک میں وفاقی نظام حکومت قائم کیا جائے گا۔ جس میں صوبوں کو مقررہ آئینی حدود میں خود مختاری حاصل ہو گی۔

(6) بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

(7) آزاد عدلیہ قائم کی جائے گی۔

قرار دادِ مقاصد کی منظوری کے بعد دستور ساز اسمبلی نے متعدد کمیٹیاں قائم کیں جن میں سب سے اہم بنیادی اصولوں کی کمیٹی اور اس کی ذیلی کمیٹیاں تھیں۔ ان کمیٹیوں نے 1950ء میں دستور ساز اسمبلی کو رپورٹ پیش کی جس میں وفاقی پارلیمانی نظام اور دو ایوانی مقننہ (پارلیمنٹ) کے علاوہ آزاد عدلیہ اور بنیادی شہری حقوق کی سفارش کی گئی۔ اس رپورٹ پر دستور ساز اسمبلی نے طویل عرصے تک غور کیا اور ان میں کچھ ترامیم پیش کیں۔ ان مجوزہ ترامیم پر بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے غور کیا اور ترمیم شدہ رپورٹ 1952ء میں اسمبلی میں پیش کی۔

## جمہوریت کی راہ میں رکاوٹیں:

قائداعظم کے انتقال کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے۔ 1951ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم مقرر ہوئے انھوں نے (بیورو کریٹ) ملک غلام محمد کو گورنر جنرل نامزد کیا۔ ملک غلام محمد کے تقرر سے ایک تو سیاست میں بیورو کریسی کے عمل دخل کی ابتداء ہوئی جس سے بعد میں بہت خرابیاں پیدا ہوئیں۔ نئے گورنر جنرل نے جمہوری روایات کی پامالی کا جو سلسلہ شروع کیا اس سے پاکستانی سیاست بری طرح تباہ ہو گئی۔

دستور ساز اسمبلی ابھی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کر رہی تھی کہ گورنر جنرل نے وزیر اعظم کو برطرف کر دیا اور اس کی توجیح یہ پیش کی کہ ملک میں آئین کی غیر موجودگی میں

وزیر اعظم کے عہدے کا کوئی جواز نہیں ہے اور گورنر جنرل کسی بھی شخص کو دستور ساز اسمبلی کا لیڈر مقرر کر سکتا ہے۔ تاہم انہوں نے خود اپنی اس دلیل کو اس وقت پس پشت ڈال دیا جب خواجہ ناظم الدین کی جگہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرا کو "وزیر اعظم" نامزد کیا۔ نئے وزیراعظم نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹوں اور دستور ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث کی روشنی میں ایک دستوری خاکہ تیار کروایا جو تاریخ میں محمد علی بوگرا فارمولا کے نام سے مشہور ہوا۔

اس فارمولے میں وفاقی پارلیمانی نظام، دوایوانی مقننہ، آزاد عدلیہ، بنیادی حقوق اور سابق مشرقی اور مغربی پاکستان کو مقننہ میں برابری کی بنیاد پر نمائندگی کی سفارش کی۔ امید تھی کہ محمد علی فارمولے کے مطابق آئین بن جائے گا لیکن 1954ء میں گورنر جنرل ملک غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی تحلیل کر دی۔

اسمبلی کو برخواست کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ محمد علی بوگرا نے خواجہ ناظم الدین کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کو دیکھتے ہوئے اسمبلی میں ایک قرار داد منظور کرانے کی کوشش کی جس کے تحت گورنر جنرل کے اختیارات کم کر کے اس سے اسمبلی تحلیل کرنے یا وزیراعظم کو برطرف کرنے کا اختیار واپس لینا مقصود تھا۔ گورنر جنرل نے اس قرار داد کی منظوری سے پیشتر ہی اسمبلی برخواست کر دی۔ جس کے خلاف اسمبلی کے سپیکر مولوی تمیز الدین نے سندھ چیف کورٹ میں مقدمہ دائر کیا۔

عدالت نے دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کے اقدام کو غلط قرار دیتے ہوئے اپنے فیصلے میں کہا کہ گورنر جنرل کو ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ گورنر جنرل کی طرف سے سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے خلاف فیڈرل کوٹ میں اپیل کی گئی۔ جسٹس منیر نے سندھ کورٹ کے فیصلے کو اس بنیاد پر منسوخ کر دیا کہ دستور ساز اسمبلی آٹھ سال گزرنے کے باوجود آئین بنانے میں ناکام رہی ہے جس کی وجہ سے اس کی نمائندہ حیثیت ختم ہو گئی ہے۔ مزید برآں فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ جس قانون کے مطابق سندھ کورٹ نے گورنر جنرل کے اقدام کو منسوخ کیا ہے خود اس قانون کو گورنر جنرل کی تائید ابھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔

فیڈرل کورٹ کے فیصلے کے بعد 11 راگست 1955ء کو ایک اور بیورو کریٹ چوہدری محمد علی

کو وزیر اعظم نامزد کیا گیا۔

## پاکستان کا پہلا آئین 1956ء:

چوہدری محمد علی نے نئی دستور ساز اسمبلی کے ذریعے سے ایک سال سے کم مدت کے عرصے میں آئین کا مسودہ اسمبلی میں پیش کر کے اسے منظور کرایا اور 23 رمارچ 1956ء کو نیا آئین نافذ ہو گیا۔ اس آئین میں 234 دفعات اور چھ ضمیمے شامل تھے۔ آئین میں اسلام کو پاکستان کے تشخّص اور سیاسی نظام کی بنیاد قرار دیا گیا۔

## 1956ء کے آئین کے اہم نکات:

1949ء کی قرار داد مقاصد کو اس آئین میں افتتاحیہ کے طور پر شامل کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی حاکیت اعلیٰ کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا تھا۔ آئین میں کہا گیا تھا کہ تمام اختیارات کو قرآن اور سنت کی روشنی میں بطور امانت استعمال کیا جائے گا۔

آئین میں واضح طور پر یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی زندگیاں اسلامی تعلیمات کے مطابق گزارنے کے لیے مواقع مہیا کیے جائیں گے اور حکومت پاکستان اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرے گی۔

1956ء کے آئین کے مطابق سربراہ مملکت کے لیے مسلمان ہونا لازم تھا۔ نیز کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا جو قرآن و سنت کے منافی ہو۔

آئین میں یہ بھی کہا گیا کہ صدر مملکت ایک کمیشن تشکیل دے گا جو موجودہ قوانین کا جائزہ لے کر انھیں اسلام کے مطابق ڈھالنے کی سفارش کرے گا۔

## 1958ء کا مارشل لاء:

1956ء کا آئین صرف اڑھائی سال نافذ رہا اور 7 راکتوبر 1958ء کو فوج نے جنرل محمد ایوب خان کی قیادت میں آئین کو منسوخ کر کے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ 14 راگست 1947ء سے لے کر 7 راکتوبر 1958ء تک کے عرصے میں ملک میں سیاسی جوڑ توڑ، انتشار اور غیر جمہوری ہتھکنڈے اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں لڑائی اور تشدّد سے بھرپور

ایک اجلاس میں ڈپٹی سپیکر کو ایوان کے اندر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ 1951ء میں لیاقت علی خان کے قتل کے بعد صرف سات سال کے عرصے میں ملک میں چھ حکومتیں تبدیل ہوئیں۔ اس سیاسی انتشار کی وجہ سے ملک میں طویل مدت کی منصوبہ بندی ممکن نہیں رہی تھی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ آزادی کے بعد سے گیارہ سال کی مدت گزرنے کے باوجود عام انتخابات کے انعقاد کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ ان حالات میں عوام سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے مایوس ہو چکے تھے اور ملک میں غیر یقینی کی فضا پائی جاتی تھی۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا جنرل ایوب خان کا سیاست میں عمل دخل گورنر جنرل غلام محمد کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا۔ غلام محمد نے ایوب خان کے ذریعے سے خواجہ ناظم الدین سے وزارت عظمیٰ کا استعفیٰ طلب کرنے کے علاوہ ایوب خان کو وزیر دفاع بھی مقرر کیا۔ اس طرح میجر جنرل سکندر مرزا کی صدارت کے دوران ایوب خان نے ملک کا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن کر تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور ملک میں فوجی آمریت کی روایت شروع کی۔ میجر جنرل سکندر مرزا جو سیکریٹری دفاع کے عہدے سے قائمقام گورنر جنرل بنے تھے (غلام محمد کے انتقال کے بعد) اور 1956ء میں پاکستان کے جمہوریہ بنائے جانے پر ملک کے پہلے صدر مقرر کیے گئے تھے۔ سکندر مرزا کا غلام محمد، محمد علی بوگرا اور چوہدری محمد علی کے بعد صدارت تک پہنچنا سیاست میں بیورو کریسی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا ایک اور ثبوت تھا۔

مارشل لاء کے نفاذ کے صرف بیس دن کے بعد جنرل ایوب خان نے سکندر مرزا کو صدارت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کیا اور انھیں ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ 27 اکتوبر 1958ء کو جنرل ایوب نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مکمل اختیارات سنبھال لئے۔

مارشل لاء کے تحت سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی اور سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ طلبہ کی جمہوری سرگرمیوں اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر بھی مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔

آزادی تحریر و تقریر ختم کر دی گئی۔ اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دیا گیا۔ پروگریسو پیپرز لمیٹڈ، جس کے تحت پاکستان ٹائمز، امروز اور ہفت روزہ لیل و نہار شائع ہوتے تھے قبضے میں لے کر ادارے پر ایک میجر جنرل کو ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا۔ نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان

(APP) کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا اور غیر ملکی نیوز ایجنسیوں پر اپنے طور پر پاکستان میں خبریں مہیا کرنے پر پابندی لگا کر انھیں اے پی۔ پی یا دوسری پاکستانی ایجنسی پی پی اے (آج کل پی پی آئی) کے ذریعے سے خبریں دینے کا پابند کیا۔

ان اقدامات کے علاوہ ایوب خان نے فوجی عدالتیں تشکیل دے کر انھیں مقدمات کے سمری ٹرائل کا اختیار دیا۔ ان عدالتوں نے مختلف نوعیت کے مقدمات میں بے شمار افراد کو مختلف سزائیں دیں جن میں بہت سے سیاستدان اور سیاسی کارکن بھی شامل تھے۔

مارشل لاء کی انتظامیہ نے متعدّد سیاستدانوں کے سیاست میں حصہ لینے پر بھی پابندی عائد کر دی۔

جنرل ایوب خان نے جمہوریت کو، خاص طور پر پارلیمانی نظام کو پاکستانی عوام کے مزاج کے خلاف قرار دیتے ہوئے ملک میں ایک نیا نظام نافذ کرنے کا فیصلہ کیا جسے "بنیادی جمہوریت" کا نام دیا گیا۔ اس نظام کے تحت براہ راست انتخاب کا طریقہ ختم کر کے اسمبلیوں اور صدر کے انتخاب کے لیے بالواسطہ انتخاب کا طریقہ رائج کیا اور اسّی ہزار ارکان پر مشتمل بنیادی جمہوریتوں کے ارکان کو صدر اور اسمبلی منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ یہ ارکان چالیس ہزار سابق مشرقی پاکستان اور چالیس ہزار مغربی پاکستان سے ہوتے تھے۔

فروری 1960ء میں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے بنیادی جمہوری ارکان کے ذریعے سے ریفرنڈم میں اعتماد کا ووٹ حاصل کیا اور صدر مملکت کے عہدے پر "منتخب" قرار دیئے گئے۔ ریفرنڈم کے بعد صدر نے چیف جسٹس آف پاکستان کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا جس نے مئی 1961ء میں اپنی سفارشات صدر کو پیش کیں۔ ان سفارشات کی روشنی میں جنرل ایوب خان نے ایک آئین تیار کرایا جسے 8 رجون 1962ء کو ملک میں نافذ کر دیا گیا۔ اس آئین میں 250 دفعات اور تین ضمیمے شامل تھے۔

## 1962ء کا آئین اور اس کے اہم نکات:

1956ء کے آئین کی طرح 1962ء کے آئین میں بھی پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا اور قرارداد مقاصد کو افتتاحیہ میں شامل کیا گیا۔ 1962ء کے آئین کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل قائم کی گئی جس میں ایسے لوگوں کو شامل کیا گیا جو مروّجہ قوانین کا جائزہ لے کر ان کے غیر

اسلامی پہلوؤں کی نشاندہی کر سکیں۔ یہ ادارہ نئے مسودات قوانین اور انتظامی فیصلوں کی اسلامی حیثیت کے بارے میں رائے دینے کا مجاز تھا۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے فیصلوں کی حکومت قانوناً" پابند نہیں تھی کیونکہ ان کی حیثیت محض مشاورتی ہوتی تھی۔

آئین کے تحت ادارہ تحقیقات اسلامیہ کا قیام عمل میں لایا گیا تاکہ جدید تقاضوں کے مطابق اسلامی فقہ اور تاریخ کی تحقیق کو فروغ دیا جا سکے۔

1964ء میں اس آئین کے تحت ملک میں صدارتی انتخاب منعقد ہوئے جس میں ایوب خان کا مقابلہ قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح نے کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح متحدہ حزب اختلاف کی متفقہ امیدوار تھیں۔ متحدہ حزب اختلاف میں مسلم لیگ کے ایک دھڑے (کونسل) کے علاوہ نیشنل عوامی پارٹی، جماعت اسلامی، عوامی لیگ، نظام اسلام اور دیگر چھوٹی جماعتیں شامل تھیں۔ جنرل ایوب خان خود مسلم لیگ (کنونشن) کے امیدوار تھے۔ جب 1962ء کے آئین کا نفاذ کیا گیا تھا تو سیاسی جماعتوں کی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس موقع پر مسلم لیگ کے کچھ ارکان نے مسلم لیگ کا کنونشن طلب کر کے کراچی میں مسلم لیگ کی بحالی کا اعلان کیا۔ ان افراد کی قیادت چوہدری خلیق الزمان کر رہے تھے۔ انہوں نے کنونشن میں ایوب خان کو مسلم لیگ کا صدر بھی منتخب کیا۔

مسلم لیگ کے دیگر ارکان نے جن کی قیادت ممتاز دولتانہ کر رہے تھے یہ موقف اختیار کیا کہ پارٹی کی بحالی کا فیصلہ کرنے کا اختیار مسلم لیگ کی کونسل کو ہے لہٰذا انہوں نے کونسل کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد کر کے مسلم لیگ کی بحالی کا اعلان کیا۔ اس طرح مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ کنونشن کے ذریعے بحال ہونے والا دھڑا کنونشن مسلم لیگ اور کونسل کے اجلاس میں بحال ہونے والا دھڑا کونسل مسلم لیگ کہلایا۔

صدارتی انتخاب میں مغربی پاکستان کے گورنر نواب آف کالا باغ (ملک امیر محمد) اور مشرقی پاکستان کے گورنر منعم خان نے انتظامیہ کو بھرپور طریقے سے ایوب خان کے حق میں استعمال کیا۔ متحدہ حزب اختلاف نے صدارتی انتخاب کے لیے پارلیمانی نظام اور براہ راست انتخابات کا نعرہ لگایا تھا۔ تاہم انتخابات کے بالواسطہ ہونے اور بنیادی جمہوریتوں کے اسّی ہزار ارکان پر سرکاری دباؤ کی وجہ سے ایوب خان انتخاب میں کامیاب قرار دیئے گئے۔

ایوب خان نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد وفاقی دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی کے نواح میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کے بعد 1960ء میں اسلام آباد کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ راولپنڈی عارضی دارالحکومت کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ صدارتی انتخاب میں فتح کے بعد کنونشن مسلم لیگ نے ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب خان کی قیادت میں کراچی میں جشن فتح منایا، جس میں پہلی بار نسلی بنیاد پر کراچی میں فساد ہوا اور متعدد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے، کیونکہ کراچی فاطمہ جناح کے حامی علاقوں میں شامل تھا۔ یہ فسادات جو "پٹھان اور مہاجر" کا رنگ اختیار کر گئے تھے ایوب خان کی آمریت کے خلاف پہلا عملی مظاہرہ تھا۔

1964ء کے انتخاب کے موقع پر شروع کی گئی متحدہ حزب اختلاف کی تحریک انتخاب میں ناکامی کے بعد ابھی جاری تھی کہ جون 1965ء میں سندھ میں رن کچھ کے علاقے میں پاکستان ور بھارت کی فوجوں کے درمیان ایک بڑی سرحدی جھڑپ ہوئی جس میں پاکستان نے بھارتی افواج سے وہ دلدلی علاقے خالی کرا لیے جن پر بھارت نے قبضہ کر کے اپنا دعویٰ ملکیت کیا تھا۔ اسی اثناء میں بھارتی مقبوضہ کشمیر میں چھاپہ مار کاروائیوں کے بعد بھارت نے پاکستان پر کشمیر میں چھاپہ مار داخل کرنے کا الزام عائد کیا اور گجرات کے نزدیک پاکستان اور کشمیر کی سرحد پر توپخانہ سے گولہ باری کی۔ اس کے جواب میں 31 ر اگست 1965ء کو آزاد کشمیر اور پاکستان کی افواج نے جموں کے نزدیک جنگ بندی لائن عبور کر کے باقاعدہ فوجی کارروائی کا آغاز کر دیا اور 5 ر ستمبر تک بہت اہم فوجی کامیابیاں حاصل کیں۔ کشمیر پر سے اس دباؤ کو ختم کرنے کے لیے بھارت نے 5 اور 6 ستمبر کی درمیانی شب کو لاہور، سیالکوٹ اور قصور کے علاقوں میں بین الاقوامی سرحد پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ ایوب خان نے 6 ر ستمبر کو 11 بجے قوم سے خطاب کیا اور بھارت کے خلاف باقاعدہ جنگ کا اعلان کر دیا۔

مغربی پاکستان میں سندھ، پنجاب اور کشمیر کی سرحدوں پر شروع ہونے والی یہ برّی، فضائی اور سمندری جنگ 17 دن تک جاری رہی جس کے دوران پاکستان کے عوام اور افواج نے اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کے حملوں کو کامیابی سے روکا اور پہلے دن کی ابتدائی کامیابی کے علاوہ جس میں بھارتی افواج لاہور اور سیالکوٹ کے علاقوں میں کچھ پاکستانی علاقوں پر قابض ہو گئی تھیں، بھارت کو کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کرنے دی۔ راجستھان کے بھارتی علاقے اور قصور میں

بھارتی قصبہ کھیم کرن اور کشمیر میں 5 ستمبر تک حاصل کیا ہوا علاقہ پاکستان کے قبضے میں تھا۔ پاکستان کی فضائیہ نے فیصلہ کن انداز سے سترہ روزہ جنگ میں بھارتی فضائیہ پر اپنی برتری ثابت کر دی تھی۔ جنگ شروع ہوتے ہی امریکہ نے پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد پر پابندی عائد کر دی حالانکہ اس وقت تک پاکستان امریکہ کے ساتھ علاقے کے دو دفاعی معاہدوں سٹو اور سیٹو میں اس کا اتحادی تھا۔

## معاہدہ تاشقند:

سترہ روزہ جنگ کے بعد سلامتی کونسل کے کہنے پر جنگ بندی ہو گئی اور سابق سویت یونین کی دعوت پر بھارت اور پاکستان روس میں تاشقند کے مقام پر بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ تاشقند میں ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاشتری کے درمیان صلح کے معاہدے پر دستخط ہوئے جسے معاہدہ تاشقند کہا جاتا ہے۔ معاہدے پر دستخط ہونے کے بعد پہلی ہی رات تاشقند میں بھارتی وزیر اعظم دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو، جو اس موقع پر تاشقند گئے تھے واپسی پر معاہدہ تاشقند کے بعض مندرجات سے اختلاف کرتے ہوئے وزارت سے مستعفی ہو گئے۔ انھیں خاص طور پر ایوب خان کے اس فیصلے سے اختلاف تھا جس کے تحت انھوں نے کشمیر کے متنازعہ علاقے میں ان علاقوں سے واپسی منظور کر لی تھی۔ جن پر پاکستان افواج نے قبضہ کیا تھا۔ ان کا موقف تھا کہ جنگ بندی لائن جسے افواج نے عبور کیا تھا بین الاقوامی سرحد نہیں ہے لہٰذا نئی جنگ بندی لائن وہ ہونی چاہیے جہاں جنگ بندی ہوئی ہے۔

پاکستانی عوام نے معاہدہ تاشقند پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ خصوصاً" نوجوان طلبہ اس معاہدے سے ناخوش تھے کیونکہ جنگ کے دوران ملک میں یہ تاثر کامیابی سے پیدا کیا گیا تھا کہ پاکستان کو جنگ میں کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ اس تاثر کی وجہ سے عوام نے جنگ کے نتیجے سے بہت سی خوش کن توقعات وابستہ کر لی تھی کہ اس نے سترہ دن تک اپنے محدود وسائل کے باوجود کئی گنا بڑے دشمن کو کامیابی سے روکے رکھا اور اسے کوئی فیصلہ کن کامیابی حاصل نہیں کرنے دی۔

## ایوب خان کے خلاف تحریک جمہوریت:

## ایوب خان کے خلاف تحریک جمہوریت:

1966ء کے ابتدائی ایام میں طلبہ کی طرف سے معاہدہ تاشقند کے خلاف ایک غیر منظم احتجاجی تحریک جاری تھی کہ بھٹو کے استعفیٰ کے بعد طلبہ کو معاہدہ تاشقند اور بھارت دشمنی کے حوالے سے ایک نوجوان ہیرو دستیاب ہوگیا اور نوجوانوں میں ان کی پذیرائی ہونے لگی۔ اسی اثناء میں لاہور اور کراچی کچھ دانشور ملک کی غیر جمہوری فضا' عوام کو نظر انداز کیے جانے' مزدوروں اور کسانوں کا استحصال اور ملکی وسائل پر چند سرمایہ دار اور جاگیردار خاندانوں کی اجارہ داری کی پالیسیوں سے نجات حاصل کرنے کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر رہے تھے۔ ان افراد میں وزارت خارجہ سے ریٹائر ہونے والے جے۔ اے رحیم (کراچی) نوجوان ترقی پسند لیڈر معراج محمد خان (کراچی) رسول بخش تالپور (کراچی) ڈاکٹر مبشر حسن (لاہور) ملک اسلم حیات ایڈوکیٹ (لاہور) محمد حنیف رامے (لاہور) اور لاہور کے کچھ سینئر پیشہ ور اخبار نویس اور اساتذہ شامل تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے وزارت خارجہ سے استعفیٰ کے بعد ان افراد نے جے۔ اے رحیم کے ذریعے ان سے رابطہ کیا اور ملکی مسائل کے حل کے لیے ایک نئی انقلابی جماعت بنانے کا مشورہ دیا۔ نئی جماعت بنانے کے فیصلہ کے بعد 31 اکتوبر اور یکم نومبر کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کی رہائش گاہ پر ایک کنونشن میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنانے کا اعلان کیا گیا جس کا چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو کو منتخب کیا گیا۔ پارٹی کے سیکریٹری جنرل کا عہدہ جے اے رحیم کو دیا گیا۔ اس کنونشن میں کل 29 افراد نے شرکت کی تھی جو پارٹی کے بنیادی ارکان قرار پائے۔

اس عرصے میں طلبہ کی احتجاجی تحریک ایک سے دوسرے شہر تک پھیل رہی تھی' جس میں ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت کے بعد تیزی آگئی تھی اور دیگر سیاسی جماعتوں نے بھی پاکستان جمہوری تحریک (پی ڈی ایم) کے نام سے اتحاد قائم کر کے ایوب آمریت کے خلاف تحریک شروع کر دی تھی 1968ء تک یہ تحریک سابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں پھیل چکی تھی اور اس میں طلبہ' سیاسی کارکن' مزدور تنظیمیں' کسان' سرکاری ملازموں کی تنظیمیں' غرض معاشرے کے ہر شعبے کے افراد اپنے مطالبات کے حق میں تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ مشرقی پاکستان اور کراچی میں تحریک میں تشدد کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا اور مظاہرین نے سرکاری املاک کو نقصان

پہنچانا شروع کر دیا تھا۔

صدر ایوب نے پی ڈی ایم کو مذاکرات کے لیے گول میز کانفرنس کی دعوت دی جسے قبول کر لیا گیا۔ تاہم مشرقی پاکستان سے مولانا بھاشانی کی نیشنل عوامی پارٹی اور مغربی پاکستان سے بھٹو کی پیپلز پارٹی نے مذاکرات سے انکار کر دیا۔ گول میز کانفرنس میں شریک جماعتوں کے مطالبے پر شیخ مجیب الرحمٰن کو مقدمہ بغاوت (اگر تلہ سازش کیس) سے رہا کر کے کانفرنس میں شریک کیا گیا۔ تاہم اس وقت تک مولانا بھاشانی اور بھٹو کی مقبولیت کی وجہ سے صورت حال ایسی ہو چکی تھی کہ گول میز کانفرنس نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی اور ایوب خان کو اپنا ہی بنایا ہوا آئین منسوخ کر کے دوبارہ اقتدار فوج کے حوالے کرنا پڑا اور آغا محمد یحییٰ خان ملک کے دوسرے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر برسر اقتدار آ گئے۔

## مارشل لاء 1969ء:

مارشل لاء انتظامیہ نے آتے ہی سیاسی جماعتوں کے تمام مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کیا اور ملک میں پہلی بار بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخاب کا پروگرام پیش کیا گیا۔

مارشل لاء انتظامیہ نے جو مطالبات تسلیم کیے وہ درج ذیل ہیں:

(1) پارلیمانی نظام بحال کرنے کا اعلان کیا گیا۔

(2) مغربی پاکستان کا ون یونٹ ختم کر کے پنجاب، سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے صوبے بحال کر دیے گئے۔

(3) بالغ رائے دہی کی بنیاد پر آبادی کے تناسب سے تمام صوبوں کو نمائندگی دینے کا اعلان کیا گیا۔

(4) تمام سیاسی مقدمات واپس لے لیے گئے۔

دسمبر 1970ء میں ہونے والے پہلے عام انتخابات میں 63 چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں اور گروپوں نے حصہ لیا جن میں سے اہم جماعتوں میں مسلم لیگ کے تینوں دھڑے، کونشن، کونسل اور قیوم لیگ شامل تھے، نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ)، پاکستان پیپلز پارٹی، عوامی لیگ، جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان، جماعت اسلامی اور پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی جو عوامی لیگ (نوابزادہ گروپ) جسٹس پارٹی اور نظام اسلام پارٹی کو ملا کر بنائی گئی تھی نے حصہ لیا۔

## انتخابات 1970ء:

طویل انتخابی مہم کے دوران ملکی آبادی سیاسی لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ایک حصہ ان جماعتوں اور گروہوں کے ساتھ تھا جو انتخاب میں مذہب کے نام پر حصہ لے رہے تھے اور دوسرا حصہ ان افراد پر مشتمل تھا جو ان جماعتوں کے ساتھ تھا جو قومی اور علاقائی' سیاسی اور اقتصادی مسائل کے پروگراموں کے تحت انتخاب لڑ رہے تھے۔ انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ کی ہمدردیاں نمایاں طور پر مذہب کے نعرے کے تحت انتخاب میں حصہ لینے والوں کے ساتھ تھیں لہٰذا بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ انتخابات میں انھیں جماعتوں کو کامیابی حاصل ہو گی۔ تاہم انتخابات کے نتائج جہاں حصہ لینے والی جماعتوں کے لیے حیران کن تھے وہاں خود انتظامیہ کے لیے بھی غیر متوقع تھے۔ قومی اسمبلی کے نتائج کے مطابق مشرقی پاکستان میں دو کے علاوہ تمام نشستیں عوامی لیگ نے جیت لیں۔ ایک نشست پر پی۔ ڈی۔ پی کے نورالامین کامیاب ہوئے جبکہ چٹاگانگ کے پہاڑی قبائل کی نشست پر راجہ تری دیو رائے بلامقابلہ منتخب ہوئے۔ پنجاب کی 83 نشستوں میں سے 62 پیپلز پارٹی نے جیت لیں۔ سندھ سے پیپلز پارٹی کو 21 اور صوبہ سرحد سے ایک نشست حاصل ہوئی۔ کونسل مسلم لیگ کو سات' کنونشن مسلم لیگ کو دو' جماعت اسلامی کو چار اور جمعیت علماء پاکستان کو تین نشستیں حاصل ہوئیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان سے نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ) جمعیت علماء اسلام نے قابل ذکر کامیابی حاصل کی۔ قیوم مسلم لیگ کے نتائج مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے مقابلے میں بہتر رہے۔ قومی اسمبلی کے نتائج کے چند روز بعد صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج حسب توقع مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ پنجاب اور سندھ میں پیپلز پارٹی' سرحد اور بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی اور جمعیت علماء اسلام کے حق میں رہے۔

## 1970-71ء کا سیاسی بحران:

مارشل لاء انتظامیہ نے جس "لیگل فریم ورک آرڈر" کے تحت انتخابات کروائے تھے اس میں نہ صرف آئندہ کے آئینی خاکے کا اعلان بھی کیا گیا تھا اور ساتھ ہی اس میں یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ قومی اسمبلی کا دستور سازی کے لیے اجلاس شروع ہونے کے نوے دن کے اندر اندر آئین بنانا لازمی ہوگا' ورنہ اسمبلی تحلیل ہو جائے گی۔

انتخابات کے نتائج نے ملک کو واضح طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے فقید المثال کامیابی حاصل کی تھی لیکن کسی دوسرے صوبے میں اس کا ایک بھی امیدوار کامیاب نہیں ہوا۔ سندھ اور پنجاب میں شاندار کامیابی حاصل کرنے والی پیپلز پارٹی مشرقی پاکستان میں غیر موجود تھی۔ پیپلز پارٹی ایک نئی جماعت تھی اور انتخابات کے وقت اس کی عمر صرف تین سال تھی اس لیے اسے باقی صوبوں میں کام کرنے کا وقت نہیں ملا۔ عوامی لیگ نے 24 سال تک غیر جمہوری حکومتوں کے ہاتھوں مشرقی پاکستان کے استحصال کو انتخابی پروگرام کا حصہ بنایا تھا اور انتخاب مشرقی پاکستان کی محرومیوں کے نعرے پر لڑا تھا۔ یہ نعرہ بنگالیوں کے لیے بہت پرکشش تھا لیکن دیگر صوبوں کو ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر واقع ایسے صوبے کے پروگرام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی جسے وہ بالکل نہیں جانتے تھے۔ اس لیے عوامی لیگ کا چھ نکاتی پروگرام مغربی پاکستان کے عوام کے لیے کسی دلچسپی کا باعث نہیں تھا۔ مسلم لیگ قیام پاکستان کے فوراً بعد سیاسی جوڑ توڑ اور محلّاتی سازشوں کا شکار ہو گئی تھی اور عوام میں اپنی مقبولیت کھو چکی تھی۔ 1970ء کے انتخاب کے وقت مسلم لیگ تین دھڑوں میں تقسیم تھی اور ان میں سے کسی بھی دھڑے کو عوامی حمایت میسر نہیں تھی۔ اگرچہ ایوب خان کی حکومت بھی مسلم لیگ ہی کی حکومت کہلاتی تھی تاہم حقیقت یہ ہے کہ ایوب خان اور ان کے ساتھی مارشل لاء کے ذریعے سے اقتدار پر پہلے ہی قابض تھے اور 1962ء میں انھوں نے مسلم لیگ کا نام اپنی آمریت کو سیاسی رنگ دینے کے لیے استعمال کیا تھا۔

ان تمام حالات کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کے تمام حصوں میں اثر و رسوخ رکھنے والی کوئی جماعت موجود نہیں تھی، جس کی وجہ سے مارشل لاء انتظامیہ کو یہ موقع مل گیا کہ وہ علاقائی رسوخ والی جماعتوں کے اختلافات کو اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے استعمال کرے۔ ان حالات میں شکست خوردہ جماعتوں نے بھی عوامی لیگ کی کامیابی کو "پاکستان دشمنی" "بھارت اور ہندوؤں کے تعاون کا نتیجہ" قرار دے کر اپنے خدشات کا اظہار شروع کر دیا۔ پیپلز پارٹی نے جو دوسری بڑی جماعت کے طور پر ابھری تھی خود کو مغربی بازو کا نمائندہ قرار دے کر عوامی لیگ سے اقتدار میں حصہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پیپلز پارٹی کا موقف یہ تھا۔ کیونکہ آئین پورے ملک کے لیے اور ایک مستقل دستاویز ہوتی ہے اس لیے آئین کسی ایک جماعت کے پروگرام کے مطابق

ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (سکینڈری ایجوکیشن) ہوتے ہیں۔ ڈویژنل سطح پر ڈائریکٹر کالجز و سکول اور ضلعی سطح پر سکولوں کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ہوتے ہیں۔

3- **سیکرٹری خزانہ:** صوبائی آمدنی و اخراجات کا نگران اعلیٰ ہے۔

4- **سیکرٹری صحت:** محکمہ صحت کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ اور ڈویژنل سطح پر ڈائریکٹر ہیلتھ اور ضلعی سطح پر ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر ہوتے ہیں۔

5- **سیکرٹری لوکل گورنمنٹ:** تمام مقامی حکومت خود اختیاری کے اداروں کا نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ سیکرٹری زراعت' پرورش حیوانات و ماہی گیری' سیکرٹری ہاؤسنگ و فزیکل پلاننگ' سیکرٹری اطلاعات' سیکرٹری سروسز اینڈ جنرل ایڈمنسٹریشن' سیکرٹری ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن' سیکرٹری زکوٰۃ و اوقاف وغیرہ ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک منصوبہ بندی اور ترقی کا بورڈ ہوتا ہے۔ اس کا سربراہ چیئرمین پلاننگ اینڈ ڈویلپمنٹ بورڈ کہلاتا ہے۔ یہ ترقیاتی منصوبے بناتا ہے۔

## مقامی حکومت کے ادارے:

**ڈسٹرکٹ کونسل:** ہر ضلع میں مقامی حکومت کا سب سے بڑا ادارہ ڈسٹرکٹ کونسل ہوتا ہے جس کے اراکین منتخب ہوتے ہیں۔ ڈسٹرکٹ کونسل اپنے ذرائع سے ضلع کی ترقی کے کام کرنے کے علاوہ حکومت کو بھی متعلقہ ضلع سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کے سلسلے میں مشورے دیتی ہے۔

**میونسپل کارپوریشن:** بہت بڑے شہروں میں میونسپل کارپوریشن ہوتی ہے۔ یہ شہر میں ترقیاتی کام کرتی ہے نیز تعلیم و صحت اور صفائی کے امور سرانجام دیتی ہے۔

**میونسپل کمیٹی و یونین کونسل:** شہر میں میونسپل کمیٹی' قصبہ میں ٹاؤن کمیٹی اور دیہات میں یونین کونسل ہوتی ہے۔ یہ سب منتخب ادارے ہوتے ہیں۔

**عدالتی نظام:** وفاقی سطح پر سپریم کورٹ ہے جو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت ہے۔ ہر صوبے میں ایک ہائی کورٹ ہے' جس کے ماتحت ہر ضلع میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت

سول جج اور مجسٹریٹ ہوتے ہیں جو انصاف بہم پہنچاتے ہیں۔

ڈویژنل نظام: ہر صوبہ مختلف ڈویژنوں میں منقسم ہے۔ ہر ڈویژن کا سربراہ کمشنر ہوتا ہے' جس کے ماتحت ڈپٹی کمشنر ہوتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع کا افسر اعلیٰ ہوتا ہے۔ تحصیل کی سطح پر اسسٹنٹ کمشنر و مجسٹریٹ ہوتے ہیں جو نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے پاس عدالتی اختیارات بھی ہوتے ہیں۔

چاروں صوبوں میں ایک جیسا نظام رائج ہے' ماسوائے قبائلی علاقوں کے جہاں وفاقی حکومت' گورنمنٹ کے ایجنٹ کے ذریعے قبائلی سرداروں سے رابطہ رکھ کر ان علاقوں کا نظم و نسق چلاتی ہے۔ سارے کا سارا قبائلی علاقہ جرگہ کے انصاف کے تحت آتا ہے یعنی انصاف جرگہ کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔ یہ جرگہ اس قبیلے کے مذہبی اور بااصول لوگوں کی ایک کونسل پر مشتمل ہوتا ہے۔ جرگے کا فیصلہ اس قبیلے کے ہر شخص پر لاگو ہوتا ہے۔

## سوالات

1- پاکستان کے محل وقوع اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔

2- پاکستان کے شمالی پہاڑی اور مغربی پہاڑی علاقہ کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔

3- مندرجہ ذیل پر مختصر نوٹ لکھیے۔

سطح مرتفع پوٹھوہار - سطح مرتفع بلوچستان - شمالی پہاڑوں کی افادیت

4- پاکستان کی آب و ہوا کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں بیان کیجے نیز آب و ہوا کے خطوں کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھیے۔

5- پاکستان کو ہم کتنے قدرتی خطوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہر ایک کا حال مفصل بیان کیجیے۔

6- مناسب الفاظ سے جملے مکمل کیجیے۔

(i) پاکستان کا کل رقبہ ____ مربع کلومیٹر ہے۔

(ii) کوہ ہمالیہ ____ کی طرف قریباً" ____ کی لمبائی میں پھیلا ہوا ہے۔

(iii) لداخ کا پہاڑی سلسلہ جسے ____ بھی کہتے ہیں۔

(iv) دریائے کرم اور گومل کے درمیان ____ کا کوہستانی علاقہ ہے۔

(v) بہاولپور میں اس ریگستانی ____ کو ____ کہتے ہیں۔

-7 صحیح یا غلط ہونے پر دیے گئے نشان پر دائرہ لگائیے:

(i) پاکستان کو آب و ہوا کے لحاظ سے 4 خطوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(ص - غ)

(iii) پاکستان میں مون سون بارشیں اکتوبر نومبر میں ہوتی ہیں۔

(ص - غ)

(iii) موسم سرما کی بارش بحیرہ روم سے آنے والے گردبادوں سے ہوتی ہے۔

(ص - غ)

(iv) درہ خیبر کی کل لمبائی 60 کلومیٹر ہے۔

(ص - غ)

(v) سردیوں میں بلوچستان کی آب و ہوا ناخوشگوار ہوتی ہے۔

(ص - غ)

5

# پاکستان کا کلچر

کلچر انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں، کسی چیز یا ذات کی جسمانی اور ذہنی نشوونما اور اصلاح وغیرہ، عام اصطلاح میں اس سے مراد انسان کی ذاتی اور اجتماعی نشوونما کے جملہ پہلو ہوتے ہیں۔ ثقافت سے مراد کسی معاشرے کے افراد کا طرز زندگی و تمدن کا حسن ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہوتے ہیں جن سے اس معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق، تفریحی شوق اور فنی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کلچر ایک کل ہوتا ہے، جس میں اس کے بسنے والوں کے عقائد، علوم، طرز معاشرت، عام معاملات، زندگی، فنون و ہنر، قوانین غرض تمام ارادی اور غیر ارادی افعال کسی نہ کسی طور شامل ہوتے ہیں۔

کسی قوم کی شناخت اس کا کلچر ہوتا ہے۔ یہ اس قوم کی وہ قدر مشترک ہے جس سے نہ صرف اس کی پہچان ہوتی ہے بلکہ دوسرے معاشروں سے ممیز حیثیت کی شناخت بھی ہوتی ہے۔ قومی کلچر کی شناخت میں پہلی اکائی فرد ہوتا ہے۔ کلچر اس کی زندگی کا مقصد، اصول اور اقدار معین کرنے میں مدد کرتا ہے۔ یہی رویہ ایک قومی سوچ اور اجتماعی تخلیق کو جنم دیتا ہے۔ چھوٹے بڑے علاقائی کلچر اور معاشرتی اکائیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر ایک وسیع تر رشتے میں نمودار ہو کر قومی سطح پر اٹھ جاتی ہیں۔

پاکستانی ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کی تاریخ نیز اسلامی تعلیمات کے ہر جہت سے اس پر اثرات کا مختصراً" جائزہ لیں۔

## انسانی کلچر کا آغاز:

انسان ابتدا میں حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا اور نہ صرف محض بنیادی ضروریات کو ہی پورا کرنا جانتا تھا بلکہ ان ضروریات کی بار آوری کا انداز بھی غیر مہذبانہ تھا۔ آہستہ آہستہ انسان نے اجتماعی سطح پر اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کیا۔ یہی وہ دور ہے جب مہذب زندگی کا آغاز ہوا۔ انسانی تہذیب کا یہ آغاز ان علاقوں سے ہوا جہاں آب و ہوا اور دیگر جغرافیائی حالات نسبتاً" بہتر زندگی کے لیے موافق تھے' چنانچہ دریاؤں کی زرخیز وادیوں میں تہذیبِ انسانی کی سحر نمودار ہوئی۔ ان وادیوں میں وادیٔ نیل (مصر) وادیٔ دجلہ و فرات (عراق) اور وادیٔ سندھ (پاکستان) شامل ہیں۔ یہ دریا اپنے ساتھ پہاڑوں کی زرخیز مٹی بہا لاتے اور میدانوں میں بچھا دیتے۔ طغیانی سے قدرتی آبپاشی کا اہتمام ہو جاتا' فصلیں بھی خوب ہوتیں۔ کہیں کہیں دریائی کناروں کے ساتھ پھیلے ہوئے ریت کے ٹیلوں پر ہرن کا شکار بھی مل جاتا۔ چونکہ ایسے خطوں میں انسان کے لیے بیشتر ضروریات میسر تھیں' اس لیے ان علاقوں میں بالخصوص آبادی کا ارتکاز ہوا اور منظم معاشرہ وجود میں آیا۔

## پاکستانی کلچر کی قدامت و تنوع:

سرزمین پاکستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں قدیم ترین انسانی تہذیب نے جنم لیا۔ اسے وادی سندھ کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ یہ مصر اور عراق کی تہذیبوں کی ہم عصر تھی اور آج سے چار پانچ ہزار سال پہلے اپنے عروج پر تھی۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہت زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب تھے۔ جن علاقوں پر آج پاکستان مشتمل ہے' ان کا محل وقوع ایسا ہے کہ یہاں وقتاً" فوقتاً" مختلف اقوام آکر آباد ہوتی رہیں۔ یہ علاقہ کچھ عرصہ ایرانی حکومت کے زیراثر رہا۔ بعد میں یونانی اور دیگر اقوام یہاں آکر آباد ہوتی گئیں۔ مسلمانوں کی آمد سے یہ خطّہ عالم اسلام کا حصہ بن گیا۔ آخر میں یورپی اقوام نے تسلط جمایا۔ یوں یہ علاقہ دنیا کی مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اس علاقے کی تہذیب نہ صرف قدیم ہے بلکہ اس میں بڑا تنوع بھی ہے اور اس میں مشرق و مغرب کی ثقافت کی تمام خصوصیات جمع ہو گئی ہیں۔

**وادیٔ سندھ کی تہذیب:** وادی سندھ سے مراد وہ علاقہ ہے جسے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا سیراب کرتے ہیں۔ اس کا موجودہ نام پاکستان ہے۔ موہنجوداڑو (ضلع لاڑکانہ۔ سندھ) اور ہڑپہ (ضلع ساہیوال۔ پنجاب) کے مقام پر قدیم ٹیلوں کی کھدائی کی گئی تو ایسے آثارِ قدیمہ سامنے آئے جن سے اس قدیم تہذیب کا پتہ چلا۔ کھدائی کے ذریعے جو اشیاء برآمد ہوئیں ان میں سب سے اہم تو خود ان شہروں کے کھنڈرات ہیں۔ شہر کی عمارات، گلی کوچے، بازار، نالیاں، حمام کافی حد تک اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار دیگر اشیاء ہیں جن سے اس زمانے کی تہذیب و تمدن، طرز زندگی، مذہب وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں گندم و جو کے ذخیرے، کھجور کی گٹھلیاں، انسان اور پالتو جانوروں کے پنجر، روئی کا کپڑا، روئی کاتنے کے اوزار، آلات جنگ، کلہاڑی، چاقو، سونے چاندی کے زیورات، مٹی و تانبے کے برتن، کھلونے، مہریں، پتھر، مٹی اور دھاتوں کے مجسمے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

**شہروں اور عمارات کی ساخت:** کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب شہری تھی۔ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے شہر وسیع اور گنجان آباد تھے۔ محلوں، گلی کوچوں اور بازاروں کی تعمیر و ترتیب میں نہایت محنت سے کام لیا گیا تھا۔ گلیاں کافی کشادہ تھیں۔ ان کا عرض 33 فٹ تک تھا۔ صفائی کا اعلیٰ انتظام تھا۔ گلیوں میں نالیاں موجود تھیں جو پختہ اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ شہروں کی عمارات بھی پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ ان سب کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس علاقے کے رہنے والوں کا ذوق اعلیٰ تھا۔

رہائشی مکانات کی تعمیر میں بڑا سلیقہ نظر آتا ہے۔ بیرونی دیواروں کے علاوہ فرش بھی پختہ اینٹوں سے تیار کیے گئے تھے۔ گھروں میں تازہ ہوا اور روشنی کا معقول انتظام تھا۔ موسم کی شدت سے بچنے کے لیے گھروں کے نیچے تہہ خانے بنائے جاتے تھے جن میں روشنی اور ہوا کا مناسب بندوبست تھا۔ پینے کے پانی کے لیے کنوئیں موجود تھے۔ گھر کے غسل خانے کشادہ اور صاف تھے۔

**گھریلو سامان اور کھلونے:** گھر کے استعمال کے لیے برتن زیادہ تر پختہ مٹی تانبے اور کانسی کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ ان برتنوں میں مٹکے، پیالے، طشتریاں اور گھڑے شامل تھے۔ چاقو، آریاں، کلہاڑے اور تانبے و کانسی کے بنے ہوئے دیگر اوزار ملے ہیں۔ تاریخی طور پر یہ ثابت

ہوتا ہے کہ یہ لوگ لوہے کے استعمال سے ناواقف تھے۔ ہڈیوں اور ہاتھی دانت کی سوئیاں اور کنگھیاں بھی ملی ہیں۔

ان لوگوں کو کھلونوں کا بہت شوق تھا۔ بڑی تعداد میں دستیاب شدہ کھلونوں میں انسانوں اور جانوروں کے مٹی کے مجسمے شامل ہیں۔ ایک کھلونا رتھ کی شکل کا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ پہیے کا استعمال جانتے تھے۔

**تجارت :** اشیائے استعمال کی ساخت میں کئی دھاتوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان میں چاندی، تانبا، کانسی اور ٹین واضح ہیں۔ زیورات میں جواہرات کا استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ دھاتیں وادیٔ سندھ میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ اس سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ دور دراز ممالک میں تجارت کی غرض سے جاتے تھے اور دھاتیں درآمد کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ افغانستان سے تانبا ترکستان سے جواہرات اور خراسان سے ٹین درآمد کرتے تھے۔

**لباس و زیبائش :** کھنڈرات میں روئی کے کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ملا ہے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ اس زمانے میں سوتی کپڑا بنا جاتا تھا۔ روئی کاتنے کے اوزار بھی کثرت سے برآمد ہوئے ہیں۔ جس قسم کا لباس اس وقت مُروّج تھا، اسے جاننے کے لیے ہمارے پاس چند مجسمے ہیں۔ ان مجسموں نے شال اوڑھ رکھی ہے، جس پر بیل بوٹے کا کام کیا ہوا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہی لباس اس زمانے میں رائج ہوگا۔

وادیٔ سندھ کے مرد و عورتیں زیورات کے شوقین تھے۔ ان زیورات میں زیادہ تر انگوٹھیاں، ہار، بالیاں اور چوڑیاں تھیں۔

**آلات جنگ :** آلات جنگ بہت کم تعداد میں دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے اسلحہ میں تانبے اور کانسی کے بنے ہوئے تیر کمان، خنجر اور کلہاڑے ملے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ امن پسند اور متمدن تھے۔ انھوں نے فنون جنگ میں زیادہ ترقی نہیں کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں نے انھیں مغلوب کر لیا۔

**مذہب :** مذہب سے متعلق معلومات کے لیے بھی ہمارے ذرائع مجسمے اور بت ہیں۔ ان میں بیشتر برہنہ عورتوں کے بت ہیں۔ ماہرین نے رائے قائم کی ہے کہ یہ ماتا دیوی کے بت ہیں جس

کی یہ لوگ پرستش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تین سروں والے دیوتا کے مجسمے بھی ملے ہیں۔ یہ لوگ مظاہر قدرت اور پتھروں کی پوجا بھی کرتے تھے۔ مردوں کو دفن کرنے کا بھی رواج تھا۔

**گندھارا آرٹ :** پنجاب اور سرحد کے ان علاقوں کو جو اس وقت راولپنڈی اور پشاور کے گرد و نواح میں واقع ہیں، قدیم زمانے میں گندھارا کا نام دیا جاتا تھا۔ آج سے دو اڑھائی ہزار سال پہلے یہاں بلند پایہ تہذیب پروان چڑھ چکی تھی جس کے فنون لطیفہ بالخصوص فن سنگ تراشی نے ساری دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔ یہ علاقہ کچھ عرصہ تک پہلے ایران اور پھر یونان کے زیراثر رہا۔ اس لیے ہندی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں نے مل کر یہاں ایسی عظیم تہذیب کو جنم دیا جس میں ساری متمدن دنیا کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں۔

گندھارا کا ثقافتی مرکز ٹیکسلا تھا جو اسلام آباد کے قریب واقع ہے۔ یہ شہر علم و فن کا مرکز تھا۔ یہاں کی درسگاہیں یونیورسٹی کا درجہ رکھتی تھیں جہاں دیگر ممالک کے طلبہ بھی تحصیل علم کی غرض سے آتے تھے۔ گندھارا کے علاقے سے سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کے بے شمار نادر نمونے ملے ہیں جو اس وقت ٹیکسلا کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔

مجسمہ سازی کے فن پر یونانی اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ خیالات، نظریات اور موضوع مثلاً گوتم بدھ کی زندگی، اس کی حالت مراقبہ وغیرہ تمام تر مقامی ہیں لیکن سنگ تراشی کی طرز بالکل یونانی ہے۔ بتوں کے خدوخال، لباس، بالوں کی بناوٹ، آرائش وغیرہ سب یونانی انداز میں ہیں۔ گویا یہ آرٹ مشرق و مغرب کے ملاپ کا نتیجہ تھا۔

## پاکستان کا ثقافتی ورثہ

ثقافت سے مراد کسی معاشرے کے افراد کی طرز زندگی و تمدن کا حسن ہے۔ اس میں وہ تمام امور شامل ہوں گے جن سے اس معاشرے کے افراد کے جمالیاتی ذوق، تفریحی شوق اور فنی مہارت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یوں ثقافت میں کسی قوم کے وہ علوم و فنون اور نظریات شامل ہوں گے، جو اسے دوسری قوموں سے منفرد اور ممتاز کرتے ہوں۔ عرفِ عام میں فنون لطیفہ اور آرٹ کو ثقافت کا مظہر خیال کیا جاتا ہے۔

مسلمان پہلی بار 712ء میں اس سرزمین پر فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ یوں اس خطہ زمین میں ایک نئی ثقافت کا دور شروع ہوا جو اپنی ہیئت اور روح کے اعتبار سے بہت بلند پایہ تھی۔ اس عہد میں فن تعمیر، مصوری، خطاطی اور موسیقی کے فن کو ترقی ملی۔ یہ سب کچھ پاکستان کے ثقافتی ورثے کا حصہ ہے۔

**مسلم فنِ تعمیر کی خصوصیات:** کسی قوم کا فنِ تعمیر اس کے ذوق اور طبعی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مسلم فنِ تعمیر ہر لحاظ سے منفرد تھا اور وہ ہندو تعمیرات سے بالکل جداگانہ اور ارفع خصوصیات کا حامل تھا:

(i) مسلم عمارات کشادہ، وسیع اور روشن ہوتی تھیں۔ ماہرین کے نزدیک اس کی وجہ خود دین اسلام کی کشادگی اور وسیع النظری ہے جس کی جھلک فن تعمیر میں ملتی ہے۔ اس کے برعکس ہندو عمارات تنگ و تاریک ہوتی تھیں۔

(ii) مسلم عمارات میں ان کے مختلف حصوں کے باہمی تناسب کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ غیر ضروری آرائش سے اجتناب کرتے ہوئے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ عمارات بحیثیت مجموعی خوش منظر اور دلفریب ہوں۔

(iii) صحیح محراب کے اصول پر صحیح گنبد بھی مسلمانوں نے بنایا۔ مسلم عمارات کے گنبد انتہائی خوبصورت تھے۔ بعض عمارات میں دوہرے گنبد بھی بنائے گئے یعنی پہلے ایک پست گنبد بنایا جاتا جس کے اندر کی طرف آرائش کی جاتی تاکہ عمارت کے اندر بیٹھ کر اس کے حسن کا نظارہ کیا جا سکے۔ اوپر ایک اور بلند گنبد بنایا جاتا تاکہ باہر سے کافی فاصلے سے بھی نظر آئے اور یوں دور سے بھی عمارت کا حسن دعوت نظارہ دے۔

(iv) مسلمانوں نے اپنی عمارتوں میں عمودی خطوط کو رواج دیا یعنی میناروں، گنبدوں وغیرہ کی لکیریں نیچے سے اوپر کو جاتی تھیں۔ اس سے عمارت کی رفعت نمایاں ہوتی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں افقی خطوط رائج تھے جن سے عمارت کے بھاری پن کا تاثر ملتا ہے۔

(v) مسلم عمارات کا افقی حصہ یعنی اوپر کا خط ایک سیدھی لکیر میں کبھی نہیں ہوتا تھا۔

وہ اس خط کو میناروں، گنبدوں، چھتریوں وغیرہ سے توڑتے تھے اور یوں افقی حصے کا نشیب و فراز عمارت کے حسن کو دوبالا کر دیتا تھا۔

**مسلم عہد کی اہم عمارات:** مسلم عہد کی اہم عمارات میں سے قطب مینار دہلی، علائی دروازہ، مقبرہ غیاث الدین تغلق، مقبرہ شیر شاہ سوری، قلعہ آگرہ، تاج محل آگرہ، لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی، مقبرہ جہانگیر لاہور، شاہی قلعہ لاہور، بادشاہی مسجد لاہور، مسجد وزیر خان لاہور، جامع مسجد ٹھٹھہ، مسجد مہابت خاں پشاور، شالامار باغ لاہور زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں سے آخری سات پاکستان میں واقع ہیں۔

### مقبرہ جہانگیر لاہور:

یہ مقبرہ جہانگیر کی ملکہ نور جہاں کی نگرانی میں تعمیر ہوا۔ اگرچہ سکھوں کے ہاتھوں اسے بہت نقصان پہنچا اور رنجیت سنگھ نے سنگ مرمر کا پورا شہ نشین اکھاڑ دیا، اس کے باوجود یہ مغل عہد کی عظیم عمارت ہے۔ اس میں مرصع کاری، کاشی کاری (ٹائلیں) اور ہندسی نقش نگاری کا کام نہایت دیدہ زیب ہے۔

### شاہی قلعہ لاہور:

لاہور کا شاہی قلعہ بادشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا۔ شاہ جہان اور اورنگ زیب نے اس میں کئی نئی عمارات بنوائیں۔ ان میں شیش محل، نولکھا، دیوان خاص، موتی مسجد وغیرہ سکھوں کی دست برد سے کسی حد تک محفوظ رہیں۔

### بادشاہی مسجد لاہور:

یہ عظیم الشان مسجد اورنگ زیب کے دور میں تعمیر ہوئی۔ یہ وسعت کے لحاظ سے دنیا کی عظیم ترین مساجد میں سے ایک ہے اور اسلامی عظمت و شوکت کا تاثر پیش کرتی ہے۔ عمارت سنگ سرخ سے بنی ہے البتہ گنبد سنگ مرمر کے ہیں۔

### مسجد وزیر خان:

قدیم شہر لاہور کے اندر واقع یہ مسجد فنی نقطہ نگاہ سے منفرد ہے۔ اس میں ایرانی طرز

کی کاشی کاری (چمکدار ٹائلوں) کے نہایت عمدہ نمونے اور نقش و نگار دیکھے جا سکتے ہیں۔

### جامع مسجد ٹھٹھہ:

سندھ کی یہ عظیم ترین تاریخی مسجد ہے جو شاہ جہانی دور کی یادگار ہے۔ اس کی رنگین آرائشی ٹائلیں آج بھی دلکش سماں پیش کرتی ہیں۔

### مسجد مہابت خاں پشاور:

پشاور شہر کے اندر یہ مسجد مہابت خاں نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کا شمار بھی مغل عہد کی عظیم یادگاروں میں ہوتا ہے۔

دیگر اہم مسلم عمارات میں شالامار باغ لاہور' چوبرجی لاہور اور مقبرہ شیخ رکن الدین (رکن عالم) ملتان قابل ذکر ہیں۔

مصوری: مسلمان جنوبی ایشیا میں اپنے ساتھ بغداد کی فنی روایات لائے۔ شروع میں محلات اور دیگر عمارات کی دیواروں اور چھتوں پر آرائشی تصاویر اور نقش و نگار بنائے گئے۔ رفتہ رفتہ فن مصوری کی روایات زیادہ پختہ ہوتی گئیں۔

مغل فرماں روا فن مصوری کے دلدادہ تھے۔ ہمایوں ایران سے دو مصوروں میر سید علی تبریزی اور خواجہ عبدالصمد کو اپنے ساتھ لایا۔ انہوں نے داستان امیر حمزہ کا مصور نسخہ تیار کیا۔ اکبر کے دور میں مصوروں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور اس فن نے بہت ترقی کی۔ رنگوں کا حسین امتزاج خاص طور پر کمال کو پہنچا۔ مصوروں نے متعدد کتابوں کے باتصویر نسخے تیار کیے اور اس عہد کی عمارات پر آرائشی تصاویر بنائیں۔

جہانگیر کو اس فن میں بے حد دلچسپی تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ محض تصویر دیکھ کر وہ مصور کو پہچان سکتا تھا۔ اس عہد میں فن مصوری نقطہ عروج کو پہنچ گیا۔ پھولوں' پودوں' جانوروں' پرندوں اور قدرتی مناظر کی نہایت خوبصورت تصاویر بنائی گئیں۔ جنگوں' محاصروں اور جانوروں کی لڑائیوں کی تصاویر حقیقت نگاری اور دلفریبی میں اپنی مثال آپ ہیں۔

موسیقی: فن موسیقی کو ترقی دینے میں مسلمانوں کی روایات نہایت شاندار ہیں۔ مسلم

جائزہ ذیل کی سطور میں درج ہے:

وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی تعلیمی ضروریات بھی بدل جاتی ہیں۔ انگریزوں کے آنے کے بعد جنوبی ایشیا میں جدید علوم کی آمد ہوئی۔ ان نئے تقاضوں کے پیش نظر ضروری تھا کہ تعلیمی نظام کو نئی جہتوں پر استوار کیا جائے۔ اس کام کی ذمہ داری سرسید احمد خاں نے سنبھالی۔ انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ جدید علوم سیکھیں اور اس میں اعلیٰ مقام حاصل کریں تاکہ ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی حیثیت ارفع و اعلیٰ رہے۔ علی گڑھ کالج اور بعد ازاں یونیورسٹی کا قیام مسلم ثقافت و تہذیب کو تحفظ دینے کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اس ادارے نے مسلمانوں کو بعد ازاں عظیم قائدین دیے جن میں مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' لیاقت علی خاں اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ شامل ہیں۔ ان قائدین نے مسلم تشخّص اور مسلمانان جنوبی ایشیا کی بیداری میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

مذہب اسلام ہی مسلمانوں کی شناخت ہے اور اسلامی ثقافت کا مرکز اولیٰ ہے - ان ایام دگرگوں میں جب کہ ہندو انتہا پسند تحریکوں (شدھی، سنگھٹن' آریا سماج) اور عیسائی مشنریوں نے اسلام پر پے در پے حملے شروع کر رکھے تھے' اس ضرورت کا احساس شدت سے ہو رہا تھا کہ اسلامی تعلیمات کی ترویج و اشاعت بڑے اعلیٰ پیمانے پر کی جائے۔

اس عصری ضرورت کے پیش نظر 1920ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس جامعہ کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہاں دینی علوم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کی تعلیم پر بھی زور دیا جاتا تھا تاکہ طالب علموں کو اپنے معاش کے سلسلے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دیوبند نے بھی اس سلسلے میں خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔

فکری سطح پر بھی مسلمان علما اور دانشوروں نے مسلم ثقافت پر اس وقتی گھٹن کو بھانپ لیا تھا' اس لیے انھوں نے بھی اپنی پوری قوت اسی کی طرف لگا دی۔ اس میں مولانا شبلی نعمانی نے اسلامی تاریخ اور روایات پر معیاری کتب تصنیف کیں اور مخالفین کو سمجھانے کی سعی کی کہ اسلام اور اس کی روایات و ثقافت' تاریخ عالم کا ایک عظیم سرمایہ ہے۔ اس کو محض سیاسی دباؤ میں کچلنا آسان نہیں' اس کا ایک شرارہ بھی الاؤ بن سکتا تھا کیونکہ اس ثقافت کا ورثہ نہایت عظیم اور اعلیٰ اقدار کا حامل ہے۔ اس ضمن میں سرسید احمد خاں اور بعض دیگر ہم عصروں مولوی

ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی نے اجتماعی فکری سعی میں نہایت عالی قدر کتب تصنیف کیں۔

مگر ان سب میں سے جس شخصیت نے نہایت گہرے اور ٹھوس نقوش تاریخ ثقافت اسلام پر چھوڑے، وہ ڈاکٹر علامہ اقبال تھے۔ ان کی شاعری کا محور مسلمانان جنوبی ایشیا اور پوری اسلامی امہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان اگر اپنی سابقہ روایات کی سربلندی کے لیے اپنے اندر خودداری اور جہد مسلسل کا جذبہ پیدا کرلیں تو دنیا کی کوئی قوم ان کو محکوم نہیں بنا سکتی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسلامی روایات اور ثقافت اتنا وسیع سرمایہ ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، وہ امت واحدہ ہیں۔ اسلام نے ان کو ایک مضبوط رسی میں پرو رکھا ہے اور یہ رشتہ مستقل اور اٹوٹ ہے۔

سیاسی طور پر علامہ اقبال نے اسلامی ثقافت کی حفاظت میں اس قدر اہم کردار ادا کیا کہ اس کی مثال بہت کم نظر آتی ہے۔ انھوں نے الٰہ آباد میں منعقدہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس 1930ء میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جنوبی ایشیا (ہندوستان) کے مسلم اکثریت کے شمال مغربی علاقوں، سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں لایا جائے، جہاں پر خالص اسلامی اقدار کے مطابق لوگ بغیر کسی مداخلت کے زندہ رہ سکیں اور اس میں صحیح مسلم ثقافت کی عمل داری ہو۔

اسی کی روشنی میں قیام پاکستان عمل پذیر ہوا اور مسلمانان جنوبی ایشیا کو ایک خطہ زمین نصیب ہوا جس سے متعلق قائداعظم نے فرمایا تھا:

> "ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک سرزمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا تھا بلکہ ہم ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں پر عمل کرسکیں"۔

الغرض یہ کہ مسلمانوں کی جنوبی ایشیا میں آمد سے لے کر پاکستان کے قیام تک کے زمانے میں سے 1857ء سے 1947ء تک کا دور مسلم ثقافت اور روایات کے لیے ایک کٹھن دور تھا مگر مسلمانان جنوبی ایشیا نے اپنے عظیم قائدین کے زیر سرپرستی اس اسلامی ساکھ اور روایات کے عظیم خزانے کو بچا لیا اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے پاکستان کے نام سے ایک آزاد اسلامی مملکت حاصل کرلی۔

**پاکستانی کلچر خدوخال:** آج پاکستان جس مقام پر کھڑا ہے اور پاکستانی کلچر کے جو خدوخال ہمیں نظر آتے ہیں' اس میں ہمارے ہزاروں سال کے اس ثقافتی سفر کا بہت حصہ ہے جس کا مختصرا" ذکر ہم پڑھ آئے ہیں۔ ہمارے میلانات' ہمارے فنون' دست کاریوں' رہن سہن' لباس' خوراک وغیرہ میں بہت کچھ اب بھی ایسا ہے جسے سمجھنے و پرکھنے کے لیے ہمیں اپنے ماضی میں بہت پیچھے جانا پڑتا ہے' مگر پچھلے ایک ہزار سال سے مذہب اسلام نے ہماری تہذیب و ثقافت کی نوک پلک درست کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

**مذہبی یک جہتی:** ہمارے کلچر کی سب سے بڑی خوبی اس کا اسلامی رنگ ہے۔ آبادی کی غالب اکثریت کا مذہب اسلام ہے اور یہی ایک مضبوط کڑی ہے جو ہمیں بھائی چارے' محبت اور دوستی کے لازوال رشتوں میں باندھے ہوئے ہے کیونکہ اسلام نسلی برتری' ذات پات اور علاقائی نخوت کی نفی کرتا ہے۔ ایک علاقے کے لوگ' دوسرے علاقے کے لوگوں کے ساتھ' ایک پیشے والے دوسرے پیشے والوں کے ساتھ اور ایک ذات والے لوگ دوسری ذات کے لوگوں میں میل جول اور رشتہ داریاں آزادانہ کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملک میں جملہ اقلیتوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر طرح کی مراعات اور آزادی حاصل ہے۔ یہ طرز عمل ملکی اتحاد و یک جہتی کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

**مخلوط کلچر:** پاکستانی کلچر ایک مخلوط کلچر ہے۔ اپنی ساخت اور ہیئت کے اعتبار سے بڑا پہلودار ہے۔ مختلف زاویوں سے دیکھنے سے اس کے پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے لوگوں پر ان کے اردگرد کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور یہ اثرات ان کے لباس' خوراک اور رہن سہن میں واضح ہوتے ہیں۔ مقامی قدیم باشندوں کے علاوہ یہاں عربی' ایرانی اور تورانی سبھی نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہر گروہ اپنے ساتھ اپنے اپنے علاقائی اور نسلی رسم و رواج' رہن سہن کے طریقے' لباس اور زبان لے کر آیا تھا۔ اس گروہی ثقافت نے دوسرے گروہوں پر اثر ڈالا۔ ان تمام ثقافتی دھاروں کا مرکز پاکستانی کلچر ہے جو سب کی پہلی اور آخری شناخت ہے۔ اس تمام تر ثقافتی روشنی کا منبع اسلام ہے۔

**مرد اور عورت کا مقام:** پاکستانی معاشرے میں مرد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہ خاندان

کا سربراہ ہوتا ہے۔ نسل باپ کے نام سے چلتی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی معاشرت میں عورت کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔ گھر کے اندر اسی کی حاکیت ہے۔ گھر کی دیکھ بھال اور اولاد کی تربیت اسی کی ذمہ داری ہے۔ عورت کو تعلیم حاصل کرنے، جائداد بنانے، کاروبار کرنے اور وراثت میں حصہ طلب کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ شادی میں اس کی رضامندی لازمی ہے۔ پاکستانی ثقافت کی بنیاد چونکہ اسلام ہے، اس لیے مرد اور عورت کے حقوق کا تعین اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہی سمجھا جاتا ہے اور اسی پر عمل ہوتا ہے۔

معاشرت: پاکستانی معاشرت بنیادی طور پر سادہ اور حیا دار ہے۔ لوگ عام طور پر روایت پسند ہیں اور ان کے رسم و رواج سادہ اور دلچسپ ہیں۔ زیادہ تر لوگ مشترکہ خاندانی نظام کے زیر اثر زندگی گزارتے ہیں۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے پیار کیا جاتا ہے۔ لوگوں میں رواداری اور بردباری کا جذبہ موجود ہے۔ عورت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اس کی عزت کی ہر صورت حفاظت کی جاتی ہے۔ گھر زیادہ تر ایسے بنائے جاتے ہیں کہ وہ باپردہ ہوں۔ زیادہ تر آبادی دیہات میں ہے جہاں لوگ کھیتی باڑی کر کے اور مویشی پال کر زندگی گزارتے ہیں۔ شہروں میں لوگ ملازمت پیشہ اور تاجر ہیں۔ شادی بیاہ اب بھی روایتی انداز میں ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر پاکستانی معاشرت روایت پسند ہونے کے ساتھ وقتی تقاضوں سے بھی ہمیشہ ہم آہنگ رہتی ہے اور اس طرح معاشرتی ترقی کا عمل جاری رہتا ہے۔

لباس: پاکستان کا قومی لباس نہایت سادہ اور باوقار ہے۔ مرد شلوار قمیض یا کرتہ شیروانی اور ٹوپی یا پگڑی پہنتے ہیں۔ عورت کے لیے شلوار قمیض اور دوپٹہ عام لباس ہے۔ علاوہ ازیں ہر علاقے کا اپنا لباس ہے جو بعض علاقوں میں نہایت خوش رنگ، بارعب اور باوقار ہونے کے ساتھ ساتھ پہننے والے کے اعلیٰ ذوق کا ضامن بھی ہوتا ہے۔ علاقائی لباس میں شلوار قمیض، تہمد، پگڑی اور ٹوپی بڑی حد تک قدر مشترک ہے۔ کڑھائی والا لباس بھی عورتوں میں مقبول ہے البتہ ہر علاقے کے لباس کی کانٹ چھانٹ، رنگ اور ڈیزائن مخصوص ہوتے ہیں مگر تمام تر لباس حیادار اور پردے کے تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔

خوراک: پاکستان میں عام لوگوں کی روزمرہ کی خوراک نہایت سادہ ہے۔ گندم کی روٹی یا

چاول کے ساتھ گوشت، دال، سبزیوں کی ترکاری استعمال کرتے ہیں اور پینے کے لیے بھینس کا دودھ، چھاچھ، قہوہ اور سادہ پانی استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں البتہ شادی بیاہ اور دعوتوں میں پر تکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ علاقائی موسمی تغیر و تبدل کے زیر اثر، مختلف علاقوں میں بعض غذائیں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ مقبول ہیں۔ مثال کے طور پر اہل سرحد چونکہ سرد اور خشک علاقے میں رہتے ہیں، اس لیے وہاں گوشت کا استعمال نسبتاً زیادہ کیا جاتا ہے۔ سندھ اور پنجاب میں دودھ، دہی، گھی، سبزیاں وغیرہ پسند کی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں دنبے کا گوشت، پھل اور خشک میوہ ہر دلعزیز ہے۔

فن تعمیر: پاکستان کے فن تعمیر کے پیچھے ہزاروں سالوں کی روایات کارفرما ہیں۔ ہمارے لوگ ہمیشہ سے ماہر تعمیرات رہے ہیں۔ موہنجوداڑو اور ٹیکسلا کی شہری تقسیم و تنظیم اور خانقاہوں کی تعمیرات، اسلامی دور کے باغات، محلات، قلعے، مقبرے اور مسجدیں، ان کے سجاوٹی نقش و نگار دیکھ کر ان لوگوں کی تعمیرات میں فنی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ موہنجوداڑو اور سرکپ کے شہر، تخت بائی اور جولیاں کی خانقاہیں، اٹک اور رہتاس کے قلعے، لاہور کے محلات، شالیمار کے باغات، لاہور اور ٹھٹھہ کی بادشاہی مسجدیں، شاہ رکن عالم (ملتان)، جام نظام الدین (**مکلی**) اور جہانگیر کے مقبرے ہمارے فن تعمیر کے بہترین نمونے ہیں۔ عام سرکاری عمارات اور پبلک عمارات میں ہمیشہ وقت کے رجحانات کے ساتھ صدیوں پرانا انداز، صحن، برآمدہ، کمرے اور ہموار چھت ابھی تک معروف ہے۔

فنون: کئی فنون میں اہل پاکستان نے کمال حاصل کر رکھا ہے۔ دھاتوں سے برتن، زیورات اور آلات بنانے کا فن اس خطے میں رہنے والوں نے پانچ چھ ہزار سال پہلے سیکھ لیا تھا۔ ہاں البتہ لوہے کا استعمال بعد میں 1000 ق م میں شروع ہوا تھا۔ موہنجوداڑو کے لوگ کانسی کو پگھلا کر ڈھلائی کے فن سے بخوبی روشناس تھے۔ اسی دور میں پتھر تراش کر مختلف اشیا بنانے اور مہریں کندہ کرنے کا فن بھی اپنے عروج پر تھا۔ سن عیسوی کی پہلی پانچ صدیوں میں شمالی پنجاب اور صوبہ سرحد (قدیم گندھارا) میں سنگ تراشی کا فن اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ یہ فن بدھ مت کے عروج کے زمانے میں یونانی اور مغربی ایشیائی اثرات کا حامل ہے۔ اب بھی اس علاقے میں ایسے لوگ موجود ہیں جو سنگ تراشی کا کام بڑی خوب صورتی سے کر لیتے ہیں۔

اسلام کا عمل دخل بڑھا تو فن کے بارے میں آہستہ آہستہ ترجیحات' میلانات اور رجحانات بھی بدلنے لگے۔ بت تراشی کی جگہ عمارتی سنگ تراشی نے لے لی۔ چوکنڈی اور مکلی کے بے شمار مقبرے اس فن کے بہترین نمونے ہیں۔ مسلمانوں نے بالخصوص مغلوں نے ان علاقوں میں جن پر آج پاکستان مشتمل ہے' اپنی عمارتوں کی بیرونی سطح کو روشن ٹائیلوں اور سجاوٹی اینٹوں سے سجایا۔ عمارتوں کے اندرونی حصوں کو تصویروں اور بتوں سے سجانے کی بجائے' دیواروں پر رنگوں سے ہندسی اشکال اور بیل بوٹوں والے پیچیدہ ڈیزائنوں سے آراستہ کیا۔ لاہور' ملتان' اچ شریف اور ٹھٹھہ کی بے شمار عمارتیں مسلمانوں کے اسی جمالیاتی ذوق کا مظہر ہیں۔

ہمارے علاقے کے رہنے والے تصویر کشی کے فن سے قدیم زمانے سے واقف چلے آ رہے ہیں۔ بت کڑا (سوات) سے ملنے والی چونے کی دیوار پر بنی ہوئی ایک رنگین تصویر سے پتا چلتا ہے کہ ہمارے ہاں دیواری تصویروں نے اس زمانے میں رواج پا لیا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ تصویر کشی کے فن کی مسلمانوں نے ہی زیادہ سرپرستی کی۔ مغلیہ دور میں تو چھوٹی تصویریں بنانے کا رواج اپنے انتہائی عروج پر تھا' اور اس کے مشہور مراکز میں سے ایک لاہور بھی تھا۔ عہد مغلیہ کے زوال کے بعد اور سکھوں کے دور میں یہ فن لاہور اور پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں سمٹ کر رہ گیا۔ موجودہ دور میں بھی کئی فنکار اس فن کو زندہ رکھنے میں کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالرحمن چغتائی (مرحوم) کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر چھوٹے فنون مثلاً زیورات سازی' سکہ سازی اور قیمتی و نیم قیمتی پتھروں کے زیورات بنانے میں ہمارے فن کار ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ٹیکسلا' لاہور' حیدر آباد اور کراچی کے عجائب گھروں میں رکھے ہوئے زیورات اور مہریں ان کے فن کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔

پاکستان کے مختلف علاقوں میں لکڑی پر کندہ کاری کا کام قدیم زمانے سے اب تک مشہور ہے۔ اس فن کے مشہور مراکز ہالہ' کشمور' ملتان' جھنگ' بھیرہ' پشاور' سوات' دیر اور کشمیر ہیں۔ اس کے علاوہ فرنیچر پر کندہ کاری' پچی کاری اور لاکھ کا کام آج بھی ترقی کر رہا ہے۔

دستکاریاں: دستکاریوں کا ہنر پاکستانیوں کو ہزارہا سال کے ورثے میں ملا ہے۔ پاکستان کے دستکار نہایت ماہر' چابک دست اور جمالیاتی ذوق کے حامل ہیں۔ زیادہ تر دست کاریوں کا ہنر نسل بعد نسل ایک ہی خاندان کے افراد کے ہاتھوں میں رہتا ہے۔ دست کاریوں کا زیادہ تر کام عورتیں

کرتی ہیں۔ کچھ دست کاریاں مرد اور عورتیں مل کر تیار کرتے ہیں۔ دست کاریوں میں قدیم ترین، مٹی کے ظروف اور چھوٹی چھوٹی مورتیاں (گھُوگھُو گھوڑے) بنانا ہے۔ یہ فن کم از کم آٹھ دس ہزار سال پرانا ہے۔ مسلمانوں نے اس فن میں یہ اضافہ کیا کہ رنگ دار ظروف کے ساتھ ساتھ روشن ٹائلیں بنانے کے ہنر کو عروج پر پہنچایا۔ آج کل روشن ظروف بنانے کا فن صرف ہالہ (سندھ) اور ملتان (پنجاب) تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مغل دور میں یہ ہنر زیادہ تر پنجاب اور سندھ تک محدود رہا۔ عام مٹی کے ظروف کے لیے گجرات (پنجاب) شہرت دوام حاصل کر چکا ہے اور آج اسی علاقے میں چینی ظروف کے بیشتر کارخانے کام کر رہے ہیں۔

پیتل، تانبے اور کانسی کے برتنوں پر کندہ کاری کا کام ہمیشہ کی طرح اب بھی پشاور میں بہترین ہوتا ہے۔ خوب صورت زیور بنانے کا فن بھی اہل پاکستان کو ورثے میں ملا ہے۔ کبھی ٹیکسلا سونے اور چاندی کے زیورات کے لیے بہت مشہور تھا اور اس کے عجائب گھر میں رکھے ہوئے کئی ہزار سال پرانے زیورات اہل ذوق کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ آج کل قریباً ہر بڑے شہر میں نازک سے نازک اور اعلیٰ زیورات بنانے والے موجود ہیں۔ چاندی کے زیور بنانے میں آج بھی پشاور، ملتان، بہاولپور اور حیدر آباد کے سنار بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔

قالین بافی کا فن بھی ہمارے ہاں قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ مغلیہ دور میں لاہور کی قالین بافی کی فیکٹری دنیا بھر میں مشہور تھی۔ پنجاب اور بلوچستان میں آج بھی یہ ہنر زندہ و تابندہ ہے۔ سندھ اور ریگستان کے لوگ بکری کے بالوں سے قالین بناتے ہیں۔ کشمیری لوگ روایتی نمدے بنانے میں ماہر ہیں اور اہل سرحد افغانی طرز کے قالینوں اور غالیچوں کو پسند کرتے ہیں۔

اہل پاکستان کو جو دیگر ہنر ورثہ میں ملے، ان میں کشیدہ کاری، سوزن کاری، پیچ ورک کے ہنر بھی شامل ہیں۔ بلوچستان اور سندھ کی خواتین اپنی قمیضوں، دوپٹوں، اوڑھنیوں، گدوں اور سرہانوں کے غلافوں پر یہ کام بڑی مہارت، صفائی اور خوب صورتی سے کرتی ہیں۔ ڈیزائنوں کے چناؤ اور رنگوں کے انتخاب، بنانے والوں کے اعلیٰ ذوق کا اظہار کرتے ہیں۔ پھلکاری اہل پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں کا ایک قدیم ہنر ہے۔ اس میں کھدر کی چادر پر خالص ریشم کے دھاگوں سے کڑھائی کا کام بڑی خوب صورتی اور معیار سے کیا جاتا ہے۔ ہزارہ اور سوات کے علاقوں میں یہ کام اب بھی مقبول ہے۔ کشمیری شالوں پر کشیدہ کاری کا کام صدیوں سے کشمیری

مسلمانوں کا طرۂ کمال رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی بہت سے کشمیری ہنرمند اس فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ملتان میں اونٹ کی کھال پر کام، سرحد کی کڑھائی والی کرتیاں، سندھ، پنجاب اور سرحد میں ہاتھ سے چھپائی والے کپڑے، چنیوٹ میں لکڑی کے فرنیچر پر کندہ کاری اور کشمیر اور ڈیرہ اسماعیل خاں میں لاکھ کا کام وغیرہ۔ الغرض پاکستان مختلف دست کاریوں کا گہوارہ ہے اور اہل حرفہ ایسے ایسے خوب صورت دست کاری کے نمونے بناتے ہیں کہ وہ لوگوں کا دل موہ لیتے ہیں۔ دست کاریوں کے بین الاقوامی میلوں میں پاکستان کی دست کاریاں خاص توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔

**کھیل تماشے اور میلے:** کھیل تماشے اور میلے ٹھیلے پاکستانی تہذیب و ثقافت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ ملک کے ہر حصے میں میلے یا تہوار، موسموں اور فصلوں کے حساب سے یا بزرگان دین کے عرس کے موقعوں پر لگتے ہیں۔ ان میلوں میں ملکی ثقافت کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ دور دور سے لوگ خوب صورت مگر سادہ لباس پہن کر دنیا کے غم بھول کر ان میلوں میں شامل ہوتے ہیں۔ عام دنوں کے علاوہ ان میلوں ٹھیلوں میں بھی کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں اور جیتنے والوں کو انعامات دیے جاتے ہیں۔

پاکستان میں بہت سی روایتی کھیلیں کھیلی جاتی ہیں۔ ان میں کشتی، کبڈی خاصی مقبول ہیں۔ سندھ میں ملاکھڑا عوامی کھیل سمجھا جاتا ہے۔ یہ کبڈی کھیلنے کا خاص انداز ہے۔ ہاکی قدیم اور مقبول کھیل ہے۔ پاکستان کی ہاکی ٹیم دنیا کی مشہور ٹیموں میں شمار ہوتی ہے۔ فٹ بال اور والی بال قریباً ہر گاؤں اور قصبے میں کھیلے جاتے ہیں۔ سکوائش میں پاکستان ہمیشہ دنیا بھر میں سرفہرست رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان کی کرکٹ کی ٹیم کا دنیا کی مشہور ٹیموں میں شمار ہوتا ہے۔ ہاکی، کرکٹ، سکوائش میں پاکستان نے بہت سے عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی پیدا کیے ہیں۔

**شادی اور بیاہ کی رسمیں:** شادی اور بیاہ کی رسموں کے سلسلے میں پاکستانی ثقافت اپنے اندر ایک اچھوتے پن کی حامل ہے۔ اس پر اسلامی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ اسلام میں شادی کا آغاز نکاح جیسی پاکیزہ رسم سے ہوتا ہے۔ اسلام میں نکاح کو ایک عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ ملک کے ہر حصے میں اس خوشی کے موقع پر لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق خوشی مناتے ہیں۔ پرتکلف کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لوگ بالخصوص بچے اور خواتین خوش نما رنگوں والے زرق برق

لباس زیب تن کرتے ہیں۔ خوب چہل پہل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ شادی والے گھر کی طرف سے گزرنے والے شخص کو بغیر پوچھے یا بتائے علم ہو جاتا ہے کہ یہاں شادی کی تقریب ہو رہی ہے۔

اسلام نے تو شادی جیسے خوشی کے موقع پر بھی انتہائی سادگی اپنانے کا درس دیا ہے مگر اس خطے کے لوگوں پر دیگر قوموں کی رسمیں بھی کسی قدر اثرانداز ہوئی ہیں جس کے نتیجے میں بعض ایسی رسمیں بھی جگہ پا چکی ہیں جنھیں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے مثلاً جہیز کی نمائش، ڈھول وغیرہ کا بجانا۔ ان قبیح رسموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انفرادی و اجتماعی نیز حکومتی سطح پر کوشش جاری ہے۔ جہیز کے سلسلے میں تو آرڈیننس بھی جاری ہو چکا ہے۔

شادی کے اخراجات کے سلسلے میں ہاتھ بٹانے کی غرض سے سلامی اور نیوتا وغیرہ کی رسم بھی رائج ہے۔

**پیدائش اور اموات کی رسمیں:** پیدائش کے وقت مٹھائی وغیرہ تقسیم کر کے اس خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق نومولود کے کانوں میں اذان دی جاتی ہے تاکہ شروع ہی سے اس کے دماغ پر کندہ ہو جائے کہ اللہ واحد و یگانہ ہے اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں۔ دوسرے لوگ مع عزیز و اقارب اس خوشی کے موقع پر مبارک باد کہنے کے لیے اس گھر جاتے ہیں، جہاں بچہ پیدا ہوا ہو۔ بیشتر لوگ نومولود کو کچھ روپے یا دیگر تحائف بھی دیتے ہیں۔

اگر کسی کے ہاں کوئی فوت ہو جائے تو اس صورت میں بھی ایک خاص طریق کار اپنایا جاتا ہے۔ تمام عزیز و اقارب اور محلے دار غم میں شریک ہوتے ہیں۔ تجہیز و تکفین کے انتظامات اکثر و بیشتر عزیز و اقارب ہی کرتے ہیں۔ گھر والوں اور دور سے آئے ہوئے مہمانوں کی خوراک کا انتظام بھی عزیز ہی کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کا آپس میں میل جول اور تعاون بڑھتا ہے۔ جس قدر زیادہ ممکن ہو لوگ جنازے میں شریک ہوتے ہیں۔ بعد میں بھی لوگ غم میں شرکت کے اظہار کے لیے غمزدہ گھرانے میں جا کر افسوس کرتے ہیں اور ہر طرح کی امداد اور تعاون کا یقین دلاتے ہیں۔ اس سے معاشرے میں بہتر تعلق پیدا ہونے کا امکان بڑھتا ہے۔

## سوالات

(الف) جامع جواب دیجیے:

(1) کلچر سے کیا مراد ہے؟ کلچر کس طرح تمام ارادی و غیر ارادی افعال کا مظہر ہوتا ہے؟

(2) کسی قوم کی شناخت اس کا کلچر ہوتا ہے، واضح کیجیے۔

(3) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے خدوخال پر مختصر مگر جامع نوٹ لکھیے۔

(4) گندھارا آرٹ کن تہذیبی اثرات کے نتیجے میں پیدا ہوا، اس کے انداز و آہنگ کو واضح کیجیے۔

(5) پاکستانی ثقافتی ورثہ کیا ہے؟ تاریخی ارتقا کی روشنی میں واضح کیجیے۔

(6) مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیے:

جنوبی ایشیا میں مسلم عہدِ حکومت کے دوران، (i) فنِ تعمیر (ii) مصوّری (iii) موسیقی (iv) خطاطی

(7) سامراجی نظام کیا ہوتا ہے؟ انگریزوں نے کس طرح جنوبی ایشیا میں مقامی شعبہ ہائے زندگی کو متاثر کیا؟

(8) جنوبی ایشیا میں اسلامی ثقافت کیونکر ہندو ثقافت سے مختلف ہے؟

(9) پاکستانی کلچر کے خدوخال کا تفصیل سے جائزہ لیجیے۔

(ب) درست کے آگے ✓ کا نشان لگائیے:

(i) کسی بھی گروہ کا کلچر اس کے ارادی افعال کا مظہر ہوتا ہے۔

(ii) پہاڑوں کے دامن میں تہذیبِ انسانی کی سحر نمودار ہوئی۔

(iii) وادیٔ سندھ کی تہذیب، ایرانی اور یونانی تہذیب کی ہم عصر تھی۔

(iv) وادیٔ سندھ کی تہذیب کا پتا موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے آثارِ قدیمہ سے لگتا ہے۔

(v) وادیٔ سندھ کی تہذیب شہری تھی۔

(vi) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے باسی تانبے کے استعمال سے ناواقف تھے۔

(vii) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے رہنے والے افغانستان سے جواہرات، ترکستان سے تانبا اور خراسان سے لوہا درآمد کرتے تھے۔

(viii) وادیٔ سندھ کی تہذیب کے لوگ جنگجو تھے۔

(ix) ہندی، ایرانی اور یونانی تہذیبوں نے مل کر گندھارا آرٹ کو جنم دیا۔

(x) گندھارا آرٹ کا ثقافتی مرکز پشاور تھا۔

(ج) مختصر جواب دیجیے:

(i) مسلمان، جنوبی ایشیا میں کب فاتح کی حیثیت سے آئے؟

(ii) فنِ تعمیر میں کشادگی، صحیح محراب اور صحیح گنبد بنانے کی ابتدا کس نے کی؟

(iii) جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ پانچ عمارات کے نام لکھیے۔

(iv) مسجد وزیر خاں کس قسم کی کاشی کاری کی وجہ سے مشہور ہے؟

(v) ہمایوں، ایران سے واپسی پر کن مصوّروں کو ساتھ لایا؟

(vi) جہانگیر کے دور میں کس قسم کی مصوّری کو عروج ملا؟

(vii) مسلم عہد کا اولین موسیقار کون تھا؟

(viii) ہندو انتہا پسند تحریکیں مسلمانوں کے خلاف کیا کرنا چاہتی تھیں؟

(ix) علامہ اقبال نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور اُمتِ مسلمہ کے لیے بالعموم کیا پیغام دیا؟

(x) قائدِاعظم نے قیامِ پاکستان کا اولین مقصد کیا فرمایا؟

(xi) پاکستانی کلچر ایک مخلوط کلچر ہے، مختصر جواب دیجیے۔

(xii) پاکستانی ثقافت کی بنیاد اسلام ہے، مختصر طور پر واضح کیجیے۔

(xiii) پاکستانی فنون کیا ہیں؟
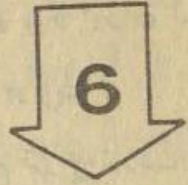
# پاکستانی زبانیں

زبان مافی الضمیر کے اظہار کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اس سے ہم اپنے خیالات اور احساسات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ زبان کی موجودہ شکل ایک طویل شعوری اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں انسان محض آواز کے سہارے اپنے جذبات اور احساسات دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان آوازوں نے مختلف الفاظ کا روپ دھار لیا۔ اس طرح الفاظ اور ان کے استعمال سے زبان ایک اہم ذریعۂ اظہار بن گئی۔

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ہے، انسان نے ابتدا میں زبان کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے استعمال کیا، لیکن بعد ازاں معاشرتی، معاشی، طبعی اور مذہبی ضرورتوں کے پیش نظر اس میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں یوں ہر معاشرے اور علاقے کی زبان اپنے مخصوص انداز میں ڈھلتی گئی۔ اس طرح مختلف علاقائی زبانوں اور بولیوں کا جنم ہوا۔

معاشرتی ضرورتوں اور انسان کے شعوری و لاشعوری محسوسات میں ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کے استعمال میں اضافہ ہوتا گیا اور الفاظ میں قوت پیدا ہوتی رہی۔ زبان کے ارتقاء میں اس مرحلے پر ادب نے جنم لیا۔ اس کا ابتدائی روپ "لوک ادب" کہلاتا ہے۔ اس قسم کے ادب میں وہاں کے بولنے والوں کے مزاج، ثقافتی پس منظر اور احساسات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جب اس قسم کا ادب اظہار کا مؤثر وسیلہ بن جاتا ہے، نیز زبانوں کے پاس ذخیرہ الفاظ میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے، تب معاشرہ شعوری اور لاشعوری کیفیات کے اظہار کے لیے "معیاری ادب" تخلیق کرتا

ہے۔ کوئی زبان جتنی زیادہ قدیم ہو گی، اس میں اتنا ہی ذخیرہ الفاظ زیادہ ہو گا اور وہ اپنے معاشرے کی وہاں کے ادب کے حوالے سے، نمائندگی کی مکمل صلاحیت رکھتی ہو گی۔

پاکستان ایک ایسے خطۂ زمین پر واقع ہے جہاں سے کئی قسم کے قدیم تہذیبی ورثے ملے ہیں، جو اپنے خدوخال اور معاشرتی اقدار کے لحاظ سے مختلف ادبوں کے مالک ہیں۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ اس کے علاوہ چھوٹی بڑی تیس کے قریب زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں اہم سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو، کشمیری اور براہوی ہیں۔

## اُردو

مختلف زبانوں کے ہونے کے باوجود پاکستان کے لوگ جہاں ایک مذہب کے تار میں پروئے ہوئے ہیں، وہاں ایک اور رشتہ زبان کا بھی ہے۔ زبان کا یہ رشتہ یہاں کی مختلف زبانوں کے اشتراک سے پیدا ہوا، جسے اُردو کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اُردو جہاں رابطے کی زبان کی حیثیت رکھتی ہے، وہاں یہ قومی تشخّص کی علامت بھی ہے۔

اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی "لشکر" کے ہیں۔ جب جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی حکومت مضبوط ہوئی تو انھوں نے اپنے لشکروں میں مختلف علاقوں کے لوگ بھرتی کیے۔ ان میں عرب، ایرانی، ترک، ہندوستانی، پنجابی، سندھی، پٹھان، بنگالی اور بلوچ وغیرہ شامل تھے۔ ظاہر ہے یہ لوگ مختلف زبانیں ہی بولتے تھے۔ ان کے میل جول سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی۔ چونکہ یہ زبان لشکر (اُردو) سے وابستہ لوگ بولا کرتے تھے، اس لیے اسے اُردو کا نام دیا گیا۔

اُردو نے مختلف ادوار میں اپنے کئی نام تبدیل کیے۔ شروع میں اسے ہندوی، ہندی اور ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں یہ ریختہ بنی۔ اس کے بعد اردوئے مُعلّٰی اور اب صرف اردو کے نام سے موسوم ہے۔

مختلف ادوار میں ناموں کی طرح اس کا ادبی آہنگ بھی بدلتا رہا مثلاً" امیر خسرو (وفات 1325ء) ہندی یا ہندوی کے قدیم شاعر گردانے جاتے ہیں۔ ریختہ کے دور میں مصحفی وغیرہ اردوئے مُعلّٰی کے دور میں مرزا غالب اور ذوق وغیرہ مشہور ہیں۔

1647ء میں جب آگرہ کی بجائے شاہ جہان نے دہلی کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو دہلی کے ایک ہی بازار میں لشکری اور خواص رہتے تھے۔ بادشاہ نے اس بازار کو اردوئے مُعلّیٰ کا خطاب دیا لہٰذا وہاں بولی جانے والی زبان کو اسی نسبت سے اردوئے معلی یا زبان دہلوی کہا جانے لگا۔ جب یہ زبان دکن اور گجرات پہنچی تو اسے دکنی اور گجراتی بھی کہا گیا۔ اس کی مقبولیت کو دیکھ کر امراء نے اس کی ترقی کے لیے مواقع پیدا کیے۔ یوں یہ بول چال کی سطح سے بلند ہو کر بہت جلد ادبی درجہ تک جا پہنچی۔

اُردو غزل کا پہلا دیوان سلطان محمد قلی قطب شاہ والئ گولکنڈہ نے مرتب کیا۔ دکن ہی کے ولی دکنی کا شمار بھی اردو کے ابتدائی شعرا میں ہوتا ہے۔ جن دکنی شعرا نے اُردو ادب کا دامن وسیع تر کیا ان میں آرزو لکھنوی' سودا' میر تقی میراور درد شامل ہیں۔ دہلی اور دکن کے علاوہ اُردو کی مقبولیت ریاست اودھ اور لکھنؤ میں بھی بڑھی۔ اسی سر زمین پر غزل کے ساتھ ساتھ مرثیہ گوئی کے فن کو بھی فروغ حاصل ہوا اور انیس و دبیر جیسے بلند پایہ شعرا اُردو کو نصیب ہوئے۔

انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں نظم کے ساتھ ساتھ اُردو نثر کو بھی ترقی ملی۔ اسی دور میں ذوق' بہادر شاہ ظفر اور مرزا غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر بھی پیدا ہوئے۔ مرزا غالب کی غزل کے ساتھ ساتھ ان کی نثر بھی اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے۔

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد جنوبی ایشیا میں سیاسی و معاشرتی حالات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ جس کے باعث تخلیقی اردو ادب نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔

سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج قائم کیا جس میں معاشرتی ترقی کے ساتھ ساتھ اُردو ادب میں نثر نے نمایاں ترقی حاصل کی۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اُردو نظم اور نثر' ہر دو میں نئے تجربات کیے اور اُردو کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ اس دور میں قومی درد بحیثیت مجموعی پیدا ہوا۔ اس زمانے میں مولانا حالی نے مُسدّس لکھی اور مسلمان قوم کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اپنے عظیم ورثے کا احساس دلایا انھی ایام میں مولانا شبلی نے اسلامی تاریخ کو ایک نئے انداز میں پیش کیا اور مغربی مستشرقین کے اعتراضات کا ٹھوس جواب دیا۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے فلسفے اور شاعری کا سورج اس کے بعد طلوع ہوتا ہے۔ انھوں

نے اپنی شاعری کے ذریعے پورے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو یہ بات سمجھانا چاہی کہ مسلمان عظیم ثقافتی، تمدنی اور نظریاتی ورثے کے حامل ہیں۔ اب ان پر جو افتاد پڑی ہے، اس کا صرف یہی حل ہے کہ وہ اپنی خودی کو مضبوط کر کے نئے حالات کا مقابلہ کریں۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں، وہ باہمی ایک رشتے میں منسلک ہیں اور اس طرح ان کی حیثیت ایک امت واحدہ جیسی ہے ان کو چاہیے کہ وہ باہم مجتمع ہو کر تمام مخالف قوتوں کا مقابلہ کریں۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری اردو اور فارسی دونوں میں کی۔ ان کی شاعری عوام میں اتنی مقبول تھی کہ لوگوں کو ان کی طویل نظمیں بھی ازبر ہوتی تھیں۔

علامہ اقبال کے بعد جدید ادب کے زیر اثر اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک نے جنم لیا۔ اس میں عقلیت پسندی کو فروغ حاصل ہوا یوں عوام کے جذبات کی عکاسی کرنے والا ادب پروان چڑھا۔ اس تحریک کے زیر اثر افسانہ اور شاعری میں جن ادبا نے نئے اسلوب اپنائے ان میں منشی پریم چند اور بعض دیگر جدید دور کے ادیب شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد اُردو ادب کی ترقی میں ایک آزاد فضا پیدا ہوئی جس میں مختلف ادیبوں نے اپنے اپنے اصناف سخن میں نمایاں کام کیے۔ ان میں اُردو شاعری، اردو ناول نگاری، ڈرامہ نویسی، افسانہ نویسی اور تحقیق و تنقید سرفہرست ہیں۔

## پشتو

پشتو صوبہ سرحد کی زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کو پشتون یا پختون کہا جاتا ہے۔ اس زبان کی ابتداء قریباً 5 ہزار سال قبل افغانستان کے علاقے باختر یا بخت میں ہوئی تھی۔ اس نسبت سے اس کو پشتون یا پختون کا نام دیا گیا جو بعد میں پختو یا پشتو بن گیا۔

پشتو اگرچہ ایک قدیم زبان ہے لیکن پشتو ادب کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ اس کا ادب بھی دوسری مہذب زبانوں کی طرح شاعری سے شروع ہوتا ہے۔ تحقیق کے مطابق پہلی کتاب آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں لکھی گئی جس کا نام پٹہ خزانہ ہے۔ نظم کا پہلا شاعر امیر کروڑ کو سمجھا جاتا ہے۔

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر تک پشتو ادب بیرونی اثرات قبول کر چکا تھا۔ اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی تراکیب شامل نظر آتی ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں نظم کے ساتھ ساتھ قصیدہ اور مرثیہ بھی پشتو کی خاص اصناف گردانی جانے لگیں۔ غیاث الدین بلبن (1265ء تا 1290) اور شیر شاہ سوری (1540ء تا 1545ء) کے دور میں قصیدہ اور مدح کی اصناف تمیں پشتو ادب کا حصہ بنیں۔

محققین کو "تذکرۃ الاولیا" نام کی ایک قدیم تصنیف ملی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے پشتو شعرا نے حمد و نعت کی اصناف پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ یہ کتاب 1200ء کی ہے۔ محمود غزنوی کے دور میں سیف اللہ نامی ایک شخص نے باقاعدہ طور پر پشتو کے حروف تہجی تیار کیے جو آج تک رائج ہیں۔ پشتو شاعری میں جو موضوعات نمایاں طور پر ملتے ہیں، ان میں حریت، غیرت، جنگ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تصوف کا تذکرہ بھی ملتا ہے، ملا مستت اس اسلوب کے پیشوا مانے جاتے ہیں۔

خوشحال خاں خٹک (1613ء تا 1691) پشتو کے عظیم شاعر ہیں۔ یہ صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف بھی تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے ان الفاظ میں کیا ہے "خوشحال کے لیے وہ لمحات قابل مسرت ہیں، جب تلوار اور زرہوں کی جھنکار ہوتی ہے"۔ خوشحال خان نے اپنی شاعری میں جن مختلف شعبہ ہائے زندگی کے متعلق لکھا۔ ان میں عشق حقیقی، عشق مجازی، جنگ بزم، تصوف، اخلاق، حریت اور بہادری خاص طور پر نمایاں ہیں۔

پشتو ادب کے دوسرے بڑے شاعر رحمان بابا ہیں۔ یہ فقیر صفت شاعر ہمیشہ عشق و تصوف میں غرق رہتے تھے اور یہی ان کی شاعری کے موضوع بھی تھے۔ ان کے نزدیک عشق ہی کائنات کی تخلیق کا باعث ہے۔ رحمان بابا کو پشتون معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

خوشحال خان خٹک اور رحمان بابا کا انداز پشتو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی چھاپ بعد میں آنے والے شعراء پر عیاں ہے۔

لوک گیت، پشتو ادب کا ایک بے نظیر سرمایہ ہیں۔ اس کی کئی اصناف ہیں، مگر چار بیتہ، ٹپہ، نیمکئی وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ بعض شعرا نے لوک گیتوں کی مختلف اصناف کو اپنی شاعری کا بھی موضوع بنایا ہے۔ ان شعراء میں نور دین اور مُلّا مقصود وغیرہ شامل ہیں۔

پشتو نثری ادب نے بیسویں صدی میں ترقی کرنا شروع کی۔ قیام پاکستان کے بعد جدید تعلیم کے زیر اثر نئے نظریات اور خیالات کے حامل اہلِ قلم نے پشتو لغات، گرامر نویسی، سوانح، افسانہ نویسی، ناول اور ڈرامے میں نمایاں کام کیا۔

پشتو زبان کے تین لہجے ہیں۔ ایک لہجہ شمال مشرق کے علاقوں کا، دوسرا جنوب مغرب کے علاقوں کا اور تیسرا زئی قبائل کا لہجہ ہے۔ ان تینوں کے مابین بنیادی طور پر صرف تلفّظ کا فرق پایا جاتا ہے۔

# سندھی

سندھی پاکستان کی ایک قدیم ترین زبان ہے اگرچہ اس زبان پر دراوڑی، سنسکرت، یونانی، ترکی، ایرانی اور دیگر قدیم زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات نمایاں ہیں تاہم عربی اور فارسی سے کافی متاثر ہوئی ہے۔ انگریزوں کی آمد کے بعد انگریزی زبان کے تو بے شمار الفاظ سندھی میں شامل ہوئے جس کے باعث سندھی زبان کا ادب اور ذخیرہ الفاظ بہت وسیع ہے۔ اور یہ زبان اپنے قدیم ثقافتی ورثے کے سبب پاکستان کی زبانوں کی نسبت زیادہ پختہ ہے۔

سندھی زبان ایک وسیع علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس وجہ سے اس کے کئی لہجے ہیں۔ سندھ کے زیریں اور راجستھانی علاقے میں لاڑی، کچھی، وچولی، کاٹھیاواڑی اور تھری کی بولیاں رائج ہیں۔ بلوچستان میں جد گالی، گنداوی، فکری، لاسی، کچھی، لوری اور چینی کے لہجے بولے جاتے ہیں جب کہ باقی علاقوں میں مستعمل بولیوں کو کوہستانی، سرائیکی اور وچولی کہا جاتا ہے۔اس کا معیاری لہجہ (ساہتی) ہے جو کہ علمی، ادبی اور صحافتی نگارشات میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے۔

سندھی زبان اس علاقے میں اسلام کے آنے سے پہلے بھی ترقی یافتہ تھی، اور سندھی میں لکھنے پڑھنے کا رواج عام تھا۔ بعد ازاں مسلمانوں کے آنے کے بعد عربی کے ساتھ ساتھ اس کو بھی باقاعدہ طور پر اہمیت حاصل رہی اور پوری اسلامی دنیا کی مقامی زبانوں میں سندھی ہی واحد زبان تھی جس میں قرآن پاک کا پہلا ترجمہ کیا گیا۔ 1050ء سے 1350ء تک کے دور میں ادبی و دینی تخلیقات میں خاص طور پر کام کیا گیا۔ یہ سندھ کی ادبی تاریخ کا ابتدائی دور تسلیم کیا جاتا ہے۔

جس میں حب الوطنی، عزم خود داری، روحانی عقائد کے موضوعات پر لکھا گیا اس دور میں داستان، قصہ، گنان، بیت، سورٹھے، گاتھا اور دوہڑے خاص طور پر قابل ذکر ادبی اصناف ہیں۔ گنان شاعری کا ایک منفرد انداز تھا جس میں اسماعیلی مبلغینؒ اسلامی عقائد کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ انھی مبلغینؒ نے 40 حرفی رسم الخط بھی ایجاد کیا جسے میمنکی یا خوجکی خط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں مختلف مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے صوفیہ کرامؒ نے بھی سندھی میں شاعری کے ذریعے اسلام کی تبلیغ شروع کی۔

اٹھارھویں صدی تک سندھی ادب میں شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سچل سرمست جیسے عظیم شاعر اپنی بے نظیر شاعری سے سندھی ادب کو مالا مال کر چکے تھے۔ اس دور کو سندھی ادب میں سنہری دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی (1689ء تا 1789ء) نے عام زندگی، اور غریب و محنت کش طبقے کی زندگی کے گن گائے اور اس میں انسانی عظمت کو اجاگر کیا۔ انھوں نے شاعری کے لیے تمثیلی انداز اختیار کیا اور وہ اپنا کلام موسیقی کے مخصوص و مقبول انداز میں پیش کیا کرتے تھے۔ جس کا بنیادی مواد وہ سندھ کی لوک کہانیوں سے لیتے تھے۔ اسی وجہ سے سندھ کے ہر کونے میں ان کی شاعری کی گونج سنائی دیتی ہے۔ "شاہ جو رسالو" ان کی شاعری کا مجموعہ ہے۔

اسی دور کے ایک عظم المرتبت شاعر عبدالوہاب المعروف سچل سرمست بھی ہیں۔ انہوں نے ہندی، سندھی، اردو، سرائیکی، پنجابی اور فارسی میں شاعری کی۔ وہ صوفی صفت انسان تھے اور تصوف میں وحدت الوجود ان کا مسلک تھا اور یہی ان کی شاعری کا معیار بھی ہے وہ لوگوں کو توحید کا درس دیتے تھے اور مجموعی طور پر ان کے اشعار کی تعداد نو لاکھ کے قریب ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ نثری ادب میں بھی اساتذہ، علما اور مبلغین کی اجتماعی کوششوں سے بہت سا سرمایہ مجتمع ہوا۔ اسی سلسلے میں ابوالحسن سندھی کی کوششیں نمایاں ہیں۔ انھوں نے سندھی کے لیے عربی رسم الخط کو بنیاد بنا کر ایک نیا رسم الخط تیار کیا۔ اس سلسلے میں دوسرا نام مخدوم محمد ہاشم (1690ء تا 1761ء) کا آتا ہے۔ وہ بہت بڑے عالم دین تھے۔ انھوں نے فارسی اور سندھی میں قریباً 150 کتابیں لکھیں جن کا موضوع اسلامی عقائد کی تصحیح و تشریح ہے۔ ان میں سے بعض کو آج بھی دینی مدارس اور مصر کی جامعۃ الازہر میں نصابی کتب کی حیثیت حاصل ہے۔

اس زمانے میں آخوند عزیز اللہ نے قرآن پاک کا نثری ترجمہ کیا۔

انگریزوں کے آنے کے بعد سندھی زبان میں ہمہ رخ علمی اور ادبی سرمایے نے ترقی کی۔ اس دور میں مرزا قلیچ بیگ (1855ء تا 1929ء) کا نام بہت اہم ہے۔ انھوں نے شاعری کے موضوعات پر کتابیں لکھیں اور دنیا کی کئی زبانوں سے اچھی اچھی کتب کے تراجم کیے۔ آپ نے جغرافیہ، تاریخ، سوانح نویسی، لغت نویسی، گرامر نویسی، تذکرہ نویسی، ڈرامہ نگاری، ناول نگاری اور تحقیق وغیرہ سمیت ہر موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد 400 کے لگ بھگ ہے۔

انگریزوں کے دامِ تسلّط میں برصغیر کی سیاسی اور سماجی زندگی میں بہت اہم تبدیلیاں آئیں اور لوگوں میں شعور پختہ ہَوا۔ اسی دور میں سندھی صحافت کو اہمیت حاصل ہوئی اور اس کو فروغ حاصل ہوا۔ البتہ کلام پاک منظور ترجمہ مولوی احمد ملاح نے 1970ء کے عشرہ میں کیا۔ بیت، وائی، کافی اور مورو وغیرہ سندھی ادب کی مخصوص شعری اصناف ہیں۔

جدید ادبی رجحانات میں سندھی دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ متاثر ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد جدید افسانہ، ڈرامہ نگاری، ادبی تحقیق اور دوسرے علمی میدانوں میں خاصا کام ہوا ہے جدید ادبا نے روایتی انداز کو جدید رجحانات سے ہم آہنگ کیا ہے اور تمام تر نثری اصناف کو جلا بخشی ہے۔ تحقیق و تنقید میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔

## پنجابی

پنجابی صوبہ پنجاب کی زبان ہے۔ اس زبان کا ربط اس علاقے کی قدیم تہذیب ہڑپائی یا دراوڑی سے ملتا ہے۔ تاریخی و جغرافیائی تبدیلیوں کے باعث اس کے چھے بڑے لہجے یا بولیاں ہیں۔ ماجھی، ملتانی یا سرائیکی، پوٹھوہاری، چھاچھی، دھنی اور شاہ پوری۔ ماجھی لہجہ معیاری لہجہ سمجھا جاتا ہے جو لاہور اور اس کے آس پاس کے علاقے میں مروج ہے۔

پنجابی زبان کے علم و ادب کی نشاندہی محمود غزنوی کے زمانے سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا نام آتا ہے۔ ان کی شاعری کا موضوع پیار و محبت، تصوّف اور حب الوطنی ہے۔ مجموعی طور پر پنجابی شاعری میں تصوّف کے رموز کا بیان خاص طور سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان میں شاہ حسین (مادھو لال حسین) سلطان باہوؒ، بلھے شاہ، خواجہ فرید شامل ہیں۔

تصوف کے ساتھ ساتھ اپنے زمانے کے معاشرتی و سیاسی حالات کا رنگ بھی ان پر غالب ہے۔ اس کا اظہار خاص علامتوں میں نظر آتا ہے' یہی وجہ ہے کہ ان سب کا کلام عوام میں بے حد مقبول ہے۔

پنجابی شاعری میں داستان گوئی بھی ایک منفرد مقام رکھتی ہے جن شعرا نے پنجابی کی لوک داستانوں کو نظم کیا' ان میں وارث شاہ کا قصہ ہیر رانجھا' ہاشم شاہ کا قصہ سسی پنوں' فضل شاہ کا قصہ سوہنی مہینوال اور حافظ برخوردار کا قصہ مرزا صاحباں مشہور ہیں۔ ان قصوں میں اعلیٰ درجہ کی شاعری کے علاوہ اس وقت کی پنجاب کی تاریخی' معاشی' مذہبی اور معاشرتی زندگی کی بھرپور جھلک بھی نظر آتی ہے۔

پنجابی ادب اپنے اظہار کے حوالے سے ایک بھرپور تصویر پیش کرتا ہے جس کی دنیا کے ادب میں نظیر نہیں ملتی۔ اس کے اصناف سخن کی تعداد زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے' جن میں زندگی کی چھوٹی چھوٹی محسوسات تک کا اظہار کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ان میں وار' ڈھولے' ماہیا' دوھے' گھوڑی' سٹھنیاں' ٹپے' سمی' بولیاں وغیرہ شامل ہیں۔

بیسویں صدی سے پہلے پنجابی نثر میں بہت کم کام ہوا اور جو ہوا وہ بھی صرف مذہبی علم تک محدود تھا۔ بعد ازاں ناول نویسی' ڈرامہ نویسی' تذکرہ نویسی تحقیق و تنقید اور دوسرے اصناف نثر میں مختلف لوگوں نے گرانقدر کام کیا ہے۔ اب ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی وجہ سے جدید ڈرامہ نویسی بھی بڑی ترقی کر رہی ہے۔

# بلوچی

بلوچ اپنی معاشرت کے اعتبار سے بادیہ نشین ہیں۔ ان کی زبان بلوچی ہے' جس کا تعلق آریائی زبانوں سے ہے۔ بلوچی زبان کے دو اہم لہجے ہیں: ایک سلیمانی اور دوسرا مکرانی۔

اگرچہ بلوچی رسم الخط پہلے ایجاد ہو چکا تھا' مگر قدیم بلوچی ادب تحریری صورت میں بہت دیر بعد میں آیا۔ مجموعی طور پر بلوچی شاعری کو 3 حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

بلوچی شاعری میں زیادہ اہم رزمیہ شاعری ہے۔ اس کے موضوعات میں ہمت' جاہ و جلال'

غیرت، برد باری اور بہادری شامل ہیں۔ دوسرا حصہ عشقیہ شاعری کا ہے۔ اس میں حسن و عشق، شباب اور دوسرے موضوعات ملتے ہیں۔ تیسرا حصہ لوک داستانوں پر محیط ہے۔ اس میں لوری اور موتک کی اصناف قدیم زمانے سے سماجی زندگی کا عکس پیش کرتی آئی ہیں۔

بلوچی زبان کی قدیم شاعری کو روشناس کرانے کا کام 1840ء میں ایک انگریز مسٹر لیچ نے کیا۔۔۔ اس کے علاوہ گورمچ، مسٹر ٹمپل اور مسٹر بروس کی انفرادی کوششیں بھی قابل ذکر ہیں، جنہوں نے بلوچی ادب کے اہم پہلو اجاگر کیے، بلوچی ادب کے کلاسیکی نثر میں میر چاکر خان، حسن زندو شلی، حمل رند و منہاد، پیرنگ و گران، نازشہ مرید و ہانی وغیرہ کے قصے مشہور و مقبول ہیں۔ انگریزوں کے دور میں جو بلوچی شاعری تخلیق کی گئی، اس میں تصوف، اخلاقیات اور انگریزوں کے خلاف نفرت کے عنوانات ملتے ہیں۔ اس دور کا بلند پایہ شاعر مست توکلی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد اُردو حروف تہجی کو گھٹا بڑھا کر بلوچی کے لیے ایک معیاری رسم الخط ایجاد کیا گیا ہے۔ 1960ء میں پہلا بلوچ مجلہ شائع ہونے سے بلوچی زبان میں صحافت اور ادب کو ایک نیا رخ ملا ہے جدید ادب میں جملہ اصناف سخن پر مشق جاری ہے۔

## کشمیری

کشمیری زبان ایک تحقیق کے مطابق وادئ سندھ کی زبانوں سے منسلک ہے۔ اس کے کئی مشہور لہجے ہیں جن میں مسلمانی، ہند کی، گندورو، کاای زیادہ مشہور ہیں۔ معیاری و ادبی لہجہ گندورو کو سمجھا جاتا ہے۔ کشمیری ادب کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(1) گیت سنگیت کا حصہ۔ جس میں لوک گیتوں کو فروغ ملا، اس قسم کی شاعری میں کشمیری سماج کی اجتماعی سوچ و احساس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ اسے کشمیری لہجے میں رؤف یا لولی کہا جاتا ہے۔

(2) شتی کنتہ کا حصہ الہٰیات کے موضوعات پر لکھا گیا۔ اس دور میں مشہور شاعر بلکہ کشمیری کے پہلے شاعر شتی کنتہ تھے۔

(3) عشقیہ داستانیں۔ اس حصے میں عشقیہ دانستانوں کو منظوم کرنے کی روایت پڑی صبا خاتون

اس عہد کی اہم شاعرہ گزری ہیں۔ اس دور کے منظوم قصّوں میں کشمیری کے علاوہ اہم فارسی و عربی قصّوں کو بھی کشمیری لباس پہنایا گیا۔ جن کے لیے ارمنی لال اور ملاّ فقیر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

(4) چوتھے دور میں کشمیری زبان و ادب پر روحانی اثر غالب رہا جس کے روح رواں محمود گامی تھے۔

(5) پانچواں دور جدید ادب کے زیر سایہ پلا بڑھا۔ یہ اپنے اندر نئے فکری رجحانات رکھتا ہے۔ غلام احمد مہجور کو اس دور میں اہم مقام حاصل ہے۔

کشمیری ادب میں مقامی تخلیقات کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں سے تراجم بھی ہوئے۔ ایرانی ادب کو، خاص طور پر غزل اور مثنوی کے تراجم کے بعد کشمیری شاعری نے بھی اپنی تخلیقی صنف کے طور پر اپنا لیا۔

# براہوی

وادیٔ سندھ کی قدیم قوم دراوڑ کی زبان براہوی ہے۔ براہوی قبائل قدیم زمانے سے ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مستقل آبادی نہ ہونے پائی، البتہ اب اس قبیلے کے لوگ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ساراوان، جھالاوان، کچھ اور مکران کے علاقوں میں ان کی آبادی گنجان ہے۔ اس زبان کے دو واضح لہجے ملتے ہیں۔ مشرقی لہجہ، سندھی زبان کے قریب ترین ہے اور مغربی لہجہ پر بلوچی اثرات غالب ہیں۔

براہوی زبان کا وجود تو قدیم ترین زمانوں سے ملتا ہے مگر اٹھارھویں صدی عیسوی سے پہلے اس کی کوئی معیاری تحریر میسر نہیں۔ اس کے معیاری ادب کی ابتدا کے بعد جس ممتاز عالم و شاعر کا نام ملتا ہے، وہ ملک داد ہیں۔ ان کی کتاب "تحفۃ العجائب" کو معیاری مانا جاتا ہے اور اس کو اہم و ابتدائی تصانیف کی حیثیت حاصل ہے۔

براہوی میں لوک ادب کا خزانہ تو بہت وسیع ہے لیکن اس کی مشہور صنف لیلی مور ہے۔

اٹھارھویں صدی میں انگریزوں کے خلاف تحریک میں تعلیم و تدریس کے لیے براہوی کو اپنایا گیا اور اس کے لیے پشتو رسم الخط سے مدد لی گئی۔ اس دور میں علمی و ادبی میدان میں نمایاں کام ہوا ہے۔ اسی دور میں کلام پاک کا ترجمہ بھی ہوا اور دیگر مذہبی موضوعات پر خاصا کام ہوا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر براہوی ادب کی ترقی کے لیے بہت سے کام کیے گئے ہیں۔

## سوالات

**(الف)**

جامع جوابات دیں:

1- زبان کی موجودہ شکل ایک طویل شعوری اور لاشعوری محنت کا نتیجہ ہے، واضح کریں۔

2- اُردو زبان کس طرح قومی تشخّص کی علامت بنتی ہے؟

3- اُردو زبان کی مختصر تاریخ لکھیں اور اس کی ترقی میں مختلف عوامل کا جائزہ لیں۔

4- پشتو زبان کی مختصر تاریخ لکھیں۔

5- سندھی زبان پر مختلف اثرات اور اس میں مختلف لوگوں کی خدمات کا جائزہ لیں۔

6- پنجابی زبان پر مختصر نوٹ لکھیں۔

7- بلوچی زبان پر مختصر نوٹ لکھیں۔

8- مندرجہ ذیل زبانوں میں ادب کا مختصر جائزہ پیش کریں:

(i) کشمیری (ii) براہوی

**(ب)**

مختصر جواب دیں:

(i) لوک ادب کسے کہتے ہیں؟

(ii) معیاری ادب کی تعریف کریں۔

(iii) سرسید احمد خاں نے کون سا کالج قائم کیا؟

(iv) تین کلاسیکی اردو شعرا کے نام لکھیں۔

(v) پشتو زبان کا پہلا شاعر کسے سمجھا جاتا ہے؟

(vi) سندھی زبان پر کون کون سی زبانوں کا اثر نمایاں ہے؟

(vii) "شاہ جو رسالو" کس شاعر کا مجموعہ کلام ہے؟

(viii) ابوالحسن نے کس زبان کے رسم الخط کو بنیاد بنا کر سندھی کا نیا رسم الخط تیار کیا؟

(ix) پنجابی زبان کا تعلق کس قدیم تہذیب سے ملتا ہے؟

(x) پنجابی زبان کے اہم لہجے بیان کریں۔

(xi) پنجابی کے تین کلاسیکی شعرا کے نام لکھیں۔

(xii) کس پنجابی شاعر کا قصہ ہیر رانجھا مشہور ہے؟

(xiii) ہاشم شاہ کی کون سی کتاب مشہور ہوئی؟

(xiv) بلوچی زبان کا تعلق کن زبانوں کے گروہ سے ہے؟

(xv) بلوچی زبان کے دو اہم لہجے تحریر کریں۔

(xvi) کشمیری زبان کے اہم لہجوں کے نام لکھیں۔ اس کا معیاری لہجہ کون سا سمجھا جاتا ہے؟

(xvii) براہوی زبان وادی سندھ کی کون سی قوم بولتی تھی؟

(xviii) براہوی زبان کے دو واضح لہجوں کے نام لکھیں۔

# 7

# اقتصادی منصوبہ بندی اور ترقی

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ عوام کا معیار زندگی ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ رہائشی، تعلیمی و طبی سہولتیں ناکافی ہیں۔ خواندگی کی شرح کم ہے۔ کم بچت اور پست سرمایہ کاری ترقی کی راہ میں اہم رکاوٹیں ہیں۔ افزائشِ آبادی کی شرح وسائل کی نسبت بلند ہے۔ غرضیکہ تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح پاکستان بھی ایک ترقی پذیر ملک ہے۔

پاکستان کے قدرتی و انسانی وسائل لاتعداد ہیں، لیکن ان وسائل کو بروئے کار لانے کے سلسلے میں کئی معاشی، معاشرتی اور بین الاقوامی رکاوٹیں موجود ہیں، مثلاً قلیل آمدنی کی وجہ سے بچت کی صلاحیت پست ہے یہی وجہ ہے کہ سرمایہ کاری کی سطح بھی پست ہے۔ مناسب معاشی ترقیاتی منصوبہ بندی کی مدد سے جملہ معاشی رکاوٹوں کا سدباب ہو سکتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے تجربے کی روشنی میں پاکستان بھی اب سائنسی و فنی ترقی اور مناسب معاشی منصوبہ بندی کو بروئے کار لا کر اپنی جملہ معاشی و اقتصادی تنگیوں سے نجات حاصل کرنے کی سعی کر رہا ہے۔ معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے انسانی و مادی وسائل کا بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نیز معاشی و سماجی بہبود کے مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

معاشی ترقیاتی منصوبے کا مقصد ملک کے باشندوں کو خوش حال اور مطمئن زندگی گزارنے کے مواقع بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ملکی پیداوار میں اضافہ کر کے قومی آمدنی کو اس حد تک بڑھایا جائے کہ قومی آمدنی میں اضافے کی شرح افزائش آبادی کے

مقابلے میں زیادہ ہو۔ اس وقت پاکستان میں آبادی قریباً 3 فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال قریباً 30 لاکھ نئے افراد کو خوراک، لباس، تعلیم، صحت اور اسی قسم کی دیگر سہولتیں بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں تمام ترقیاتی منصوبوں کا مقصد قومی آمدنی میں اس قدر اضافہ کرنا ہے کہ اگر موجودہ شرح افزائشِ آبادی قائم بھی رہے تب بھی ملکی مجموعی ترقی کا عمل رکنے نہ پائے۔ یاد رہے کہ اگر افزائشِ آبادی کی شرح قومی آمدنی کی شرح سے زیادہ ہو تو فی کس آمدنی میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں معاشی ترقی کا عمل ست ہو سکتا ہے۔ پاکستان کی معیشت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر توجہ اس امر کی طرف مبذول ہے تاکہ سائنسی و فنی میدانوں میں فوقیت حاصل کر کے معاشی و اقتصادی ترقی کو تیز تر کیا جا سکے۔ ساتواں پانچ سالہ منصوبہ (1988ء تا 1993ء) اس امر کی واضح عکاسی کرتا ہے۔

ملکی معیشت ایک زندہ جسم کی مانند ہوتی ہے۔ اس میں بہت سے شعبے مثلاً زراعت، صنعت، تجارت، ذرائع نقل و حمل و رسائل، کان کنی، تعمیرات، بجلی و گیس، مکانات، صفائی، تعلیم وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ معیشت مربوط طور پر ایک مشین کی طرح کام کرتی ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کے ذریعے مختلف شعبوں کو ایک خاص شرح سے اور مربوط انداز میں خاص سمت کی طرف ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ معیشت میں ایک خاص رفتار سے اضافہ ہو سکے۔ مختلف شعبوں کے لیے ہدف (Targets) مقرر کیے جاتے ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے بامقصد و باضابطہ معاشی ترقیاتی منصوبے کے عمل کے تحت مالیاتی وسائل مہیا کیے جاتے ہیں۔

معاشی ترقی ایک لمبا عمل ہے لہٰذا ماہرین کی رائے میں اسے ایک دو سالوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کسی زرعی ملک میں اگر کسی سال قدرتی موسم سازگار ہونے کی وجہ سے زرعی پیداوار بڑھ جائے تو یہ قومی آمدنی میں محض وقتی اضافے کا باعث بنے گی، کیونکہ آئندہ سالوں میں موسمی حالات غیر موافق بھی ہو سکتے ہیں۔ معاشی ترقی تو بہرحال قومی آمدنی میں مسلسل ایک طویل عرصہ تک اضافے کی وجہ سے ہو گی، اسی لیے ترقیاتی منصوبوں کی مدت عام طور پر پانچ سال رکھی جاتی ہے۔ پاکستان کے تمام ترقیاتی منصوبوں کی مدت بھی پانچ سال ہے۔ معاشی ترقی کو جانچنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے، لہٰذا اس امر کے پیش نظر بعض اوقات ایک طویل المیعاد

تناظری منصوبہ پیش کیا جاتا ہے جس کی مدت بیس سال تک ہو سکتی ہے۔ اس بیس سالہ منصوبے کے دوران میں آنے والے پانچ سالہ منصوبے اس طویل المدت منصوبے کا حصہ ہوتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں بالخصوص کئی معاشی پراجیکٹ لمبے عرصے کے ہوتے ہیں' اس لیے ان کی تکمیل کے لیے مدت بھی طویل درکار ہوتی ہے لہٰذا ایسے طویل المیعاد منصوبے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جس میں پانچ سالہ منصوبوں کے نتائج کی لچک کو سمویا جا سکے۔ اگر کسی پانچ سالہ منصوبے کے ہدف غیر موافق معاشی حالات کی وجہ سے پورے نہ ہو سکیں تو انھیں تناظری منصوبے میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ موافق حالات کے حامل منصوبے میں انھیں پورا کر دیا جائے۔ اس طرح مطلوبہ شرح ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ الغرض معاشی ترقیاتی منصوبہ بندی کا مقصد کسی ملک کی قومی آمدنی میں ایک طویل عرصہ تک اضافہ کرنا ہے تاکہ فی کس آمدنی بڑھنے کی بدولت لوگوں کی زندگی کا معیار بلند ہو اور ملک کے جملہ شعبہ جات میں مجموعی ترقی محسوس ہونے لگے۔

قیام پاکستان کے وقت ملکی معیشت پسماندہ تھی۔ عوام کے لیے جملہ سہولتوں کے مواقع محدود تھے۔ کاشت کاری کے طریقے پرانے تھے۔ زراعت میں مشینوں کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا۔ صنعت برائے نام تھی۔ بچتوں کو جمع کر کے پیداواری مقاصد میں لگانے کا منظم مالیاتی نظام موجود نہ تھا۔ نقل و حمل' رسل و رسائل اور خبر رسانی کے ذرائع محدود تھے۔ پاکستان نے معاشی ترقی کے سفر کا آغاز انھی نامساعد حالات میں کیا۔

1955ء میں پاکستان میں پہلی مرتبہ جامع معاشی منصوبہ بندی کا آغاز کیا گیا۔ پہلا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ (1955ء تا 1960ء) تیار کیا گیا جس نے معاشی ترقی کے لیے ایک جامع اور مربوط پروگرام پیش کیا۔ اس منصوبے کے بنیادی مقاصد اور ان کے اہداف کے اہم نکات درج ذیل تھے۔

(i) قومی آمدنی میں پندرہ فی صد اضافہ کرنا۔

(ii) فی کس آمدنی میں سات فی صد اضافہ کرنا۔ آبادی میں 1.4 فی صد سالانہ اضافے کی توقع تھی۔

(iii) بیس لاکھ نئے افراد کے لیے روزگار مہیا کرنا۔

(iv) برآمدات میں پندرہ فی صد اضافہ کرنا۔

(v) منصوبے کے اختتام تک ادائیگیوں کے توازن میں بیس کروڑ روپے کی بچت کرنا۔

(vi) اناج کی پیداوار میں 9 فی صد اضافہ کرنا۔

(vii) نقد آور فصلوں کی پیداوار میں اضافہ کرنا۔ چند ایک کی تفصیل یوں ہے۔ گنے میں تینتیس فی صد' کپاس میں 21 فی صد' پٹ سن میں 15 فی صد۔

(viii) دیہی زرعی و صنعتی ترقیاتی پروگرام کو دیہی آبادی کے ایک چوتھائی پر وسعت دینا تاکہ دیہی علاقوں میں زرعی و صنعتی پیداوار کے طریقوں کو بہتر بنایا جائے۔

(ix) صنعتی پیداوار میں ساٹھ فی صد اضافہ کرنا۔ صنعتوں میں سے ہوزری' چینی' کھاد' سیمنٹ اور قدرتی گیس کو اہمیت دینا مقصود تھا۔

(x) سولہ لاکھ ایکڑ اراضی کو آبپاشی کی بہتر سہولتیں فراہم کرنا۔

(xi) بجلی کی پیداواری استعداد میں تین گنا اضافہ کرنا۔

(xii) پرائمری سکولوں میں 10 لاکھ اور ثانوی سکولوں میں قریباً ڈیڑھ لاکھ نئے بچوں کی تعلیم میں اضافہ کرنا اور کم از کم اسی قدر تعداد میں نئے بچوں کو تعلیم کی ترغیب دینا۔

(xiii) نجی بچتوں میں پانچ فی صد سے سات فی صد تک اضافہ کرنا۔

(xiv) اڑھائی لاکھ نئے مکانات تعمیر کرنا

درج بالا مقاصد اور ہدف کو حاصل کرنے کی غرض سے دس ارب اسی کروڑ روپے خرچ کرنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس میں سے ساڑھے سات ارب سرکاری شعبہ جات کے لیے اور تین ارب تیس کروڑ روپے نجی شعبے کے لیے مختص کیے گئے تھے۔

مقاصد کے اعتبار سے یہ منصوبہ نہایت اچھا تھا لیکن بوجوہ اس کے ہدف پورے طور پر حاصل نہ ہو سکے۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ اس منصوبے پر عمل درآمد تاخیر سے ہوا (1955ء کی بجائے 1957ء سے)۔ دیگر وجوہات میں سے ایک اہم وجہ یہ ہوئی کہ اسی عرصے میں حکومت نے روپے کی بیرونی قدر کم کر دی جس سے منصوبے میں لگائے گئے تخمینے کسی حد تک

ناقص ہو گئے۔ موسمی حالات کی خرابی اور سیم و تھور کی بنا پر زمین کی تباہی دیگر اہم وجوہات میں شامل ہیں۔

منصوبے کا جائزہ لینے سے درج ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(i) قومی آمدنی میں 15 فی صد کی بجائے صرف 11 فی صد اضافہ ہوا۔

(ii) فی کس آمدنی 7 فی صد کی بجائے صرف 3 صد بڑھ سکی۔ اس سلسلے میں یہ نوٹ کرنا بھی ضروری ہے کہ آبادی میں اضافے کی شرح قریباً" 1.6 فی صد سالانہ رہی۔

(iii) پانچ سال کے عرصے کے دوران میں جتنے افراد کام کرنے کے اہل ہوئے' ان میں سے پچاس فی صد سے بھی کم کو روزگار مہیا کیا جا سکا۔

(iv) زرمبادلہ کمانے کے ہدف کو بھی حاصل نہ کیا جا سکا کیونکہ اس عرصے کے دوران میں برآمدات کو نہ بڑھایا جا سکا' بلکہ اس کے برعکس درآمدات کی مقدار میں اضافہ ہو گیا' یہی وجہ ہے کہ توازن ادائیگی خاصا خراب ہو گیا' یہاں تک کہ پہلے چار سالوں کے دوران میں توازن ادائیگی میں 24 کروڑ روپے کا خسارہ واقع ہو گیا۔

(v) اناج کی پیداوار میں نو فی صد اضافے کی بجائے صرف چار فی صد اضافہ ہو سکا۔

(vi) موسمی حالات کی خرابی و بعض دیگر وجوہات کی بنا پر دیگر فصلوں کا پیداواری ہدف بھی حاصل نہ کیا جا سکا

(vii) اندرونی ملک بچتوں کا جو ہدف مقرر کیا گیا تھا' وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ ملکی بچتوں کی شرح منفی 21 فی صد تک کم ہو گئی۔

(viii) صنعتی میدان میں البتہ کئی صنعتیں قائم ہوئیں مثلاً کاغذ' نیوز پرنٹ' گتہ' کھاد' کیمیائی اشیاء سے متعلق صنعتیں وغیرہ۔

درج بالا اعداد و شمار سے اندازا لگایا جا سکتا ہے کہ پہلا پانچ سالہ منصوبہ بیشتر میدانوں میں ناکام رہا۔ اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے تجربات کی بدولت نئی

سوچ اور انداز فکر نے جنم لیا جس سے آئندہ کے ترقیاتی منصوبہ جات کو تشکیل دینے میں مدد ملی۔

دوسرا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ (1960ء تا 1965ء) پہلے منصوبہ کی مدت اختتام پر اپنایا گیا۔ اس منصوبے کے بڑے بڑے مقاصد اور ان کے اہداف درج ذیل تھے:

(i) قومی آمدنی میں 24 فی صد اضافہ کرنا۔

(ii) فی کس آمدنی میں 10 فی صد اضافہ کرنا۔

(iii) 25 لاکھ نئے افراد کو روزگار کے مواقع فراہم کرنا۔

(iv) زرعی پیداوار میں چودہ فی صد اضافہ کرنا۔

(v) بڑی اور اوسط درجے کی صنعتوں کی پیداواری صلاحیت میں 14 فی صد تک اضافہ کرنا۔

(vi) گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کی پیداوار کو 25 فی صد تک بڑھانا۔

(vii) برآمدات میں سالانہ تین فی صد اضافہ کرنا۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے مقاصد اور ہدف کو پورا کرنے کے لیے 23 ارب روپے کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔ اس رقم میں سے بارہ ارب چالیس کروڑ روپے سرکاری شعبے، تین ارب اسی کروڑ روپے نیم سرکاری شعبے اور چھے ارب اسی کروڑ روپے نجی شعبے میں خرچ کرنے کا اندازا لگایا گیا تھا۔

باوجود اس بات کے کہ دوسرے ترقیاتی منصوبے میں بھاری صنعت کے قیام اور اس کی ترقی کو اس کا صحیح مقام نہیں دیا گیا تھا نیز اس منصوبے کے لیے غیر ملکی سرمائے اور امداد پر انحصار کیا جاتا تھا، اس منصوبے کے تحت ملک کی معاشی ترقی کی رفتار خاصی تسلی بخش رہی۔ بعض شعبوں میں تو ترقی اس حد سے بھی زیادہ ہوئی جو منصوبہ بناتے وقت قائم کی گئی تھی۔

منصوبے کا جائزہ لینے سے مندرجہ ذیل نکات توجہ کا مرکز بنتے ہیں:

(i) قومی آمدنی میں اضافہ 30 فی صد سے بھی بڑھ گیا۔

(ii) برآمدات میں سات فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا۔

(iii) شعبہ صنعت میں 40 فی صد سے زیادہ ترقی ہوئی۔

(iv) زرعی شعبے میں ترقی 15 فی صد سے زیادہ ہوئی۔

(v) روزگار کے مواقع متوقع حد تک نہ بڑھائے جا سکے' اس طرح اس شعبے کی ترقی کی رفتار غیر معیاری رہی۔

درج بالا جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دوسرا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ خاصی کامیابی سے ہم کنار ہوا' بلکہ کئی شعبوں میں تو ترقی مقررہ ہدف سے بھی بڑھ گئی۔ پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی میں دوسرے پانچ سالہ منصوبے کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس منصوبے کی تشکیل میں پہلے منصوبے کی خامیوں کو دور کیا گیا اور ملکی وسائل کا جائزہ لینے میں خاصی احتیاط سے کام لیا گیا۔ اس منصوبے کی کامیابی سے مزید حوصلہ افزائی ہوئی جو مستقبل کی منصوبہ بندی میں ممد و معاون ثابت ہوئی۔

دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کی کامیابی کے بعد تیسرا پانچ سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ یہ ایک بیس سالہ تناظری منصوبے کا حصہ تھا جسے طویل المیعاد تناظری منصوبے (1965ء تا 1985ء) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بیس سالہ تناظری منصوبہ چار پانچ سالہ ترقیاتی منصوبوں پر مشتمل تصور کیا گیا۔ اس تناظری منصوبے کے اہم ہدف قومی آمدنی میں چار گنا اضافہ کرنا' تمام افرادی قوت کو 1985ء تک روزگار فراہم کرنا' غیر ملکی امداد پر انحصار ختم کرنا' نیز ملک کے مختلف حصوں میں فی کس آمدنی کے تفاوت کو ختم کرنا شامل تھے۔

تیسرے منصوبے کے بڑے بڑے مقاصد اور ان کے اہداف درج ذیل تھے:

(i) ملکی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا اور قومی پیداوار میں 37 فی صد اضافہ کرنا۔

(ii) فی کس آمدنی میں 20 فی صد اضافہ کرنا۔

(iii) 55 لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنا۔

(iv) زرعی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا اور اس میں 5 فی صد سالانہ اضافہ کرنا۔

(v) صنعتی ترقی کی شرح 13 فی صد سالانہ تک بڑھانا۔

(vi) علاقائی تفاوت کو ختم کرنا۔

(vii) بنیادی صنعتوں کے قیام کو ترجیح دینا۔

(viii) زرمبادلہ میں اضافہ کر کے ادائیگیوں کے توازن میں استحکام پیدا کرنا۔

(ix) بنیادی سہولتوں میں اضافے کی سعی کرنا۔

(x) معاشرتی تحفظ مہیا کرنا۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے کل 52 ارب روپے مختص کیے گئے تھے۔ ان میں سے 30 ارب سرکاری شعبہ جات کے لیے اور 22 ارب نجی شعبے کے لیے وقف تھے۔

درج بالا مقاصد و کوائف سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیسرا پانچ سالہ منصوبہ بہت سی خوبیوں کا حامل تھا مگر اس کی ترقی کا جائزہ لینے کے بعد جو تصویر سامنے آتی ہے' اس کا خاکہ کچھ یوں ہے:

(i) زرعی ترقی کی رفتار متوقع رفتار سے کم رہی یعنی صرف 4.5 فی صد سالانہ ترقی ہو سکی۔

(ii) برآمدات میں 9.5 فی صد اضافے کی توقع تھی مگر اس کے مقابلے میں یہ اضافہ صرف 7 فی صد رہا۔

(iii) صنعتی میدان میں ترقی صرف 9 فی صد ہو سکی حالانکہ یہ ہدف 13 فی صد کا تھا۔

(iv) سرمایہ کاری کی شرح میں قریباً" 4 فی صد کمی ہو گئی۔

مختصراً" تیسرا پانچ سالہ منصوبہ پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکا اور بیشتر شعبوں میں مقرر کردہ ہدف تک نہ جا سکا۔ دراصل ناسامعد حالات نے ابتدا ہی سے تیسرے منصوبے کو گھیر لیا۔ ابتدائی دو سالوں میں زبردست خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا جس سے فصلیں بری طرح متاثر ہوئیں۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے دفاعی اخرجات بڑھ گئے جس کی وجہ سے ترقیاتی اخراجات کے لیے مجوزہ وسائل میں کمی پیدا ہو گئی۔ غیر ملکی امداد میں بھی 27 فی صد کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ زرعی ترقی میں کمی ہوئی۔ اندرون ملک حالات ہنگاموں کی نذر ہو گئے جس سے صنعتی پیداوار پر برا اثر پڑا۔ مختصراً" تیسرے پانچ سالہ منصوبے کو مجوزہ حقیقی وسائل و سازگار حالات میسر نہ آ سکے جو معاشی ترقی کے پروگرام کے لیے درکار تھے۔

چوتھا پانچ سالہ منصوبہ (1970ء تا 1975ء) بیس سالہ تناظری منصوبے (1965ء تا 1985ء) کی تیسری کڑی تھی۔ اس منصوبے کے اہم بنیادی اغراض و مقاصد اور ہدف درج ذیل تھے:

(i) معاشی ترقی کی رفتار کو برقرار رکھنا یعنی قومی پیداوار میں 6.5 فی صد شرح

سالانہ سے اضافہ کرنا۔

(ii) 75 لاکھ نئے افراد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنا۔

(iii) ملک کے مختلف حصوں کے مابین فی کس آمدنی کے فرق کو کم کرنا۔

(iv) غذائی اجناس کی پیداوار میں 85 لاکھ ٹن کا اضافہ کرنا۔

(v) سماجی انصاف قائم کرنا یعنی قابل عمل پالیسیوں کی مدد سے معاشی ترقی اور سماجی انصاف میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔

(vi) برآمدات میں ساڑھے آٹھ فی صد سالانہ اضافہ کرنا۔

ان مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے 75 ارب روپے مختص کیے گئے تھے ان میں سے 49 ارب سرکاری شعبہ جات کے لیے اور 26 ارب نجی شعبوں کے لیے رکھے گئے تھے۔

چوتھے پانچ سالہ منصوبے پر بوجہ پاک بھارت جنگ و دیگر اندرون ملک ناساعد حالات عمل درآمد نہ ہو سکا اور اس منصوبے کو بالآخر منسوخ کرنا پڑا۔

ملک میں معاشی و سیاسی حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے 1971ء تا 1978ء کے دوران میں سال بہ سال قلیل المیعاد منصوبہ بندی ہی کی جا سکی۔ ماہرین کی رائے میں اوسط المیعاد منصوبہ بندی عدم استحکام کی وجہ سے مشکل ہو جاتی ہے۔ قلیل المیعاد منصوبہ بندی کے ذریعہ سے طویل المیعاد پراجیکٹوں کی تکمیل مناسب انداز میں نہیں ہو پاتی۔ یک سالہ ترقیاتی منصوبوں سے عام طور پر مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر قلیل المعیاد منصوبہ بندی کی مدد سے معاشی ترقی کی رفتار کو برقرار نہیں رکھا جا سکا' لہٰذا متذکرہ عرصہ کے دوران میں خاطر خواہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔

پانچواں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ (1978ء تا 1983ء) یکم جولائی 1978ء کو اپنایا گیا۔ اس منصوبے کے اہم مقاصد اور ان کے اہداف یہ تھے:

(i) قومی پیداوار میں اضافہ کرنا۔

(ii) زرعی و صنعتی شعبوں کی ترقی کی طرف توجہ کرنا۔

(iii) غذائی اجناس میں مکمل طور پر خود کفیل ہونا۔

(iv) دیہی علاقوں کی ترقی پر زور دینا اور وہاں جملہ معاشرتی خدمات فراہم کرنے

کے سلسلے میں خاطر خواہ سعی کرنا۔ ان میں تعلیمی اداروں و ہسپتالوں کا قیام اور پینے کے پانی کی فراہمی شامل ہیں۔

(v) شہری علاقوں میں پینے کے پانی کی رسد بڑھانا، مکانات کی تعمیر کرنا اور ذرائع نقل و حمل کو بہتر بنانا۔

(vi) پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے ایک حکمت عملی کو اپنانا۔

(vii) بنیادی صنعت اور انجنیئرنگ کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنا۔

(viii) طویل المدت معاشی ترقی کے لیے بنیادیں فراہم کرنا۔

پانچویں منصوبے کے بڑے بڑے اہداف مندرجہ ذیل تھے:

(i) قومی پیداوار میں 7.2 فی صد سالانہ اضافہ کرنا۔

(ii) زرعی شعبے میں 6 فی صد سالانہ ترقی کرنا۔

(iii) صنعتی میدان میں مجموعی طور پر 10 فی صد سالانہ کے حساب سے ترقی کرنا۔

(iv) اندورن ملک بچتوں کی شرح 12.5 فی صد تک بڑھانا۔

(v) برآمدات میں 11 فی صد سالانہ کے حساب سے اضافہ کرنا۔

(vi) پیٹرولیم کی پیداوار میں اس حد تک اضافہ کرنا کہ کل ضرورت کا تینتیس فی صد سے زیادہ اندرون ملک پیداوار سے پورا کیا جا سکے۔

(vii) فی کس آمدنی میں 9.2 فی صد سالانہ اضافہ کرنا۔

(viii) توانائی کی فی کس پیداوار میں قریباً 42 فی صد اضافہ کرنا۔

(ix) دیہی علاقوں کی ترقی پر زور دینا اور صحت کے شعبے میں ہر جہت سے اضافہ کرنا، نئے ہیلتھ یونٹ و ہسپتال قائم کرنا، ہسپتالوں میں مزید بیماروں کے علاج کی گنجائش نکالنا، ڈاکٹروں اور نرسوں کی تعداد میں اضافہ وغیرہ۔

(x) بنیادی صنعت اور انجنیئرنگ کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنا۔

پانچویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کا جائزہ 21 ارب دو کروڑ تھا۔ اس میں سے 14 ارب 82 کروڑ سرکاری شعبہ جات کے لیے اور 6 ارب 20 کروڑ پرائیویٹ شعبے کے لیے مختص کیے گئے تھے۔

پانچواں پانچ سالہ منصوبہ جون 1983ء کو اختتام پذیر ہوا۔ اس مدت کے دوران میں بین الاقوامی حالات کافی مخدوش تھے۔ ترقی پذیر ممالک بالخصوص ان ناسازگار بین الاقوامی حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ پاکستان بھی ان حالات سے نہ بچ سکا۔ اس کے باوجود یہ منصوبہ بعض جہتوں سے کامیاب رہا۔ حکومت کے ایک جائزہ کے مطابق :

(i) پانچویں پانچ سالہ منصوبہ نے اپنے 90 فی صد ہدف مکمل کر لیے۔

(ii) ناساز گار حالات کے باوجود 6 فی صد سالانہ اضافے کی شرح کو برقرار رکھا جا سکا۔

(iii) ملک کے کم ترقی یافتہ علاقوں میں ترقی کی رفتار بہتر ہوئی۔

(iv) صوبہ بلوچستان میں ترقیاتی اخراجات کے ضمن میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔

(v) اس منصوبے کی مدت کے دوران دیہی علاقوں کی ترقی کی طرف بالخصوص توجہ دی گئی۔

(vi) کم از کم بیس فی صد نادار، مفلوک الحال لوگوں کو نظام زکوۃ کی بدولت معاشی اعانت ملی۔ سماجی و معاشی انصاف کی طرف یہ ایک بڑا قدم ہے۔

(vii) خوراک کے معاملے میں کسی قدر خود کفالت ہوئی۔

(viii) افراط زر پانچ سال قبل کی شرح 16 فی صد سے کم ہو کر صرف پانچ فی صد رہ گیا۔

(ix) صنعتی پیداوار میں 9 فی صد سالانہ ترقی ہوئی۔

(x) ملکی صنعت میں اضافے کی غرض سے صنعتی چھوٹیں بھی دی گئیں۔

(xi) اس پانچ سالہ منصوبے کے تحت جتنے دیہاتوں کو بجلی فراہم کی گئی ان کی تعداد اس سے قبل کے تیس سالوں سے زیادہ ہے۔

چھٹا پانچ سالہ منصوبہ (1983ء تا 1988) یکم جولائی 1983ء کو شروع کیا گیا۔ اس منصوبے کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے :

(i) معاشی ترقی کی رفتار کو تیز کرنا۔

(ii) سماجی انصاف کا احیا کرنا۔

(iii) دیہی ترقی کو خاص اہمیت دینا۔

(iv) دیہات میں سڑکوں کا جال بچھا کر انھیں شہری منڈیوں کے ساتھ منسلک کرنا۔

(v) زیادہ سے زیادہ دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنا تاکہ دیہی معیشت میں ایک خوش گوار انقلاب ممکن ہو سکے۔

(vi) منصوبے کے تحت تعلیم و صحت کے شعبوں کو ترجیح دینا۔

(vii) ملک بھر میں روزگار اور آمدنی میں اضافے کے لیے ایک خاص پروگرام پر عمل کرنا۔

(viii) زکوٰۃ اور نظام عشر کے توسط سے 15 لاکھ سے زیادہ مستحقین کی مالی اعانت کرنا۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے (1988ء تا 1993ء) کے بنیادی مقاصد کا خاکہ درج ذیل ہے :-

(i) روزگار کے مواقع فراہم کرنا تاکہ کم از کم تعلیم یافتہ افراد بیروزگاری کا شکار نہ ہوں۔

(ii) بنیادی ضروریات مثلاً خوراک، رہائش، صحت، تعلیم و دیگر سہولیات کو ترجیحی بنیادوں پر فراہم کرنا۔

(iii) افرادی قوت کو تربیت یافتہ بنانا۔

(iv) اپنی مدد آپ کے اصول پر کام کرتے ہوئے قومی معیشت کو مضبوط بنانا۔

(v) نجی شعبے کی اہمیت کے پیش نظر اسے اس کا جائز مقام دے کر ملکی معیشت کے لیے فعال بنانا۔

(vi) غیر ملکی امداد پر کم سے کم انحصار کرنا۔

## پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ جات کا جائزہ

(رقوم ملین روپوں میں)

| شعبہ | پہلا منصوبہ | دوسرا منصوبہ | تیسرا منصوبہ | چوتھا منصوبہ و غیر منصوبہ جاتی عرصہ | پانچواں منصوبہ | چھٹا منصوبہ | ساتواں منصوبہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| | 1955-60 | 1960-65 | 1965-70 | 1970-78 | 1978-83 | 1983-88 | 1988-93 |
| زراعت | 461 | 902 | 1377 | 6492 | 16112 | 14250 | 15600 |
| پانی | 969 | 4597 | 4513 | 12810 | 16451 | 32000 | 28400 |
| طاقت | 607 | 1293 | 1760 | 13841 | 39395 | 100000 | 124300 |
| صنعت | 742 | 478 | 786 | 11294 | 25610 | 15000 | 9000 |
| معدنیات | 124 | 94 | 271 | 492 | 480 | 4950 | 7000 |
| ذرائع رسل و رسائل | 1060 | 1595 | 2521 | 15653 | 37673 | 63620 | 61500 |
| فزیکل پلاننگ و ہاؤسنگ | 505 | 957 | 698 | 5687 | 11900 | 22800 | 20000 |
| تعلیم و افرادی قوت | 232 | 463 | 563 | 3442 | 5944 | 20500 | 25700 |
| صحت | 76 | 174 | 281 | 2381 | 4984 | 14600 | 13400 |
| بہبود آبادی کا پروگرام | — | 9 | 145 | 820 | 660 | 1800 | 3500 |
| متفرق | 67 | 44 | 289 | 2632 | 4410 | 5480 | 41600 |
| میزان | 4863 | 10606 | 13204 | 75544 | 163619 | 295000 | 350000 |

ماخذ: چھٹا اور ساتواں پانچ سالہ منصوبہ جات
پلاننگ ڈویژن، حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

ترقیاتی منصوبوں کا سرسری جائزہ لینے کے بعد اب ہم پاکستان کی معیشت میں چند شعبوں کی اہمیت کو زیر بحث لائیں گے۔

زراعت : یہ پاکستانی معیشت کا اہم شعبہ ہے جو بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر دو اعتبار سے دیہات میں رہنے والے قریباً" 70 فی صد لوگوں کے لیے روزگار فراہم کرتا ہے۔ زرعی شعبہ ملکی آبادی کو خوراک مہیا کرتا ہے' نیز بیشتر ملکی صنعتوں کو خام مال بھی یہی شعبہ فراہم کرتا ہے۔ ہمارے ہاں مجموعی ملکی پیداوار میں زراعت کا حصہ 26.4 فی صد ہے۔

مختلف قومی منصوبوں میں زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے (1955ء 1960ء) میں اناج کی پیداوار میں اضافے کو بڑی اہمیت دی گئی تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کو ملکی وسائل سے خاطر خواہ خوراک مہیا کی جا سکے۔ مصنوعی کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کے بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیق کی گئی۔ اس پروگرام کے نتیجے میں مختلف زرعی اجناس کی پیداوار میں 90 فی صد اضافے کی توقع تھی تاکہ درآمدات پر انحصار میں کمی ہو سکے' لیکن یہ زرعی ہدف حاصل نہ کیا جا سکا۔ نتیجتاً غیر ملکی اناج پر قوم کے دار و مدار میں اضافہ ہوتا گیا۔ دوسرے منصوبے (960ء تا 1965ء) میں بھی اناج میں خود کفالت حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ زراعت میں ترقی کی شرح 1.3 فی صد سے بڑھ کر دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں 3.5 فی صد ہو گئی' لیکن خوراک کے ضمن میں خود کفالت کا ہدف پھر بھی حاصل نہ ہو سکا اور ملک خوراک کی درآمد پر کثیر زرمبادلہ خرچ کرتا رہا۔ 1969ء - 1970ء تک تیسرے پانچ سالہ منصوبے میں گزشتہ منصوبے کی طرح خوراک کی پیداوار میں خود کفالت کے حصول کو ترجیح دی گئی۔ کاشت کاروں کو مصنوعی کھاد' بہتر بیج اور زرعی آلات کے استعمال کے لیے امدادی قرضے دیے گئے۔ پودوں کی حفاظت کے طریقے بھی بروئے کار لائے گئے۔ تجویز پیش کی گئی کہ وسیع پیمانے پر کاشت کاروں کو مدد دی جائے تاکہ زراعت میں سالانہ ترقی کی شرح 5 فی صد ہو جائے۔ ان اقدامات کے کسی حد تک مثبت نتائج برآمد ہوئے اور تیسرے پانچ سالہ منصوبے کے اختتام پر زرعی ترقی کی شرح 4.5 فی صد ہو گئی۔ چوتھے پانچ سالہ منصوبے (1970ء تا 1975ء) میں بھی خوراک میں خود کفالت کے حصول کو کافی اہمیت دی گئی۔ اس منصوبے میں خام مال کی پیداوار میں اضافے کے لیے ترقی یافتہ طریقوں کے استعمال کی سفارش کی گئی تاکہ پیداوار ملک میں استعمال کرنے کے علاوہ

برآمد بھی کی جا سکے۔ اس منصوبے میں کاشت کاروں کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لیے جملہ اقدامات کرنے کی سفارش کی گئی تاکہ انھیں بہتر زندگی گزارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جا سکیں۔ پانچویں منصوبے کے دوران شعبہ زراعت میں جدید طریقوں کے استعمال کو مزید اہمیت دی گئی تاکہ پیداوار میں اضافہ ہو سکے۔ کیمیائی کھاد اور پانی کے بہتر استعمال کی ترغیب دلانے کا انتظام کیا گیا۔ اس منصوبے کے مطابق پانی کی فراہمی میں 12 فی صد اضافہ، مصنوعی کھاد کی فراہمی میں 100 فی صد اضافہ اور بیج کی تقسیم میں 118 فی صد اضافہ شامل تھا، فیصلہ کیا گیا کہ نسبتاً کم ترقی یافتہ علاقوں کے کاشت کاروں کو بالخصوص جدید طریقوں کی ترغیب دی جائے گی۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے (1983ء تا 1988ء) کے مقاصد میں مصنوعی کھاد و بہتر بیج کے استعمال اور زرعی قرضوں کی فراہمی کو اہمیت دی گئی۔ ساتویں منصوبے کی خاص بات یہ ہے کہ چھوٹے کھیتوں میں بھی کاشت کاری کے جدید طریقے استعمال میں لائے جائیں گے۔ چھوٹے ٹریکٹر اور مشینیں کاشت کاروں کو مہیا کی گئیں تاکہ چھوٹے اور درمیانے درجے کے کسانوں کی حالت بہتر بنائی جا سکے۔

زراعت کو ترقی دینے کے لیے اسے برآمد پر مبنی صنعت کا درجہ دیا گیا ہے، جو زراعت کے شعبے کی ترقی میں بالخصوص اور ملکی ترقی میں بالعموم ایک مثبت انقلابی قدم ہے۔

دیہی ترقی: پاکستان کی قریباً 70 فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دیہات میں فی کس آمدنی شہر کی فی کس آمدنی سے قریباً 34 فی صد کم ہے۔ شہروں کی نسبت دیہات میں معاشی ترقی کے مواقع کم میسر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہات کے لوگوں میں شہروں کی طرف نقل مکانی کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ ماضی میں جو ترقیاتی منصوبے بنائے گئے تھے، ان میں شہری علاقوں کی ترقی کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔ شہری اور دیہاتی علاقوں میں معاشی مواقعوں کے درمیان عدم توازن دور کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی ترقی پذیر معیشت کے لیے دیہاتی ترقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے دیہی ترقی کی بدولت دیہاتی آبادی کی اکثریت کو معاشی ترقی کے مواقع حاصل ہوں گے، ان کا معیار زندگی بلند ہوگا اور دیہی معیشت میں مثبت اور خوش گوار تبدیلی رونما ہو گی۔

1953ء میں دیہی زرعی اور صنعتی ترقی کا پروگرام شروع کیا گیا تاکہ دیہاتی علاقوں کے

وسائل اور افرادی قوت کو اہم نوعیت کے تعمیری کاموں میں بروئے کار لایا جا سکے۔ اس پروگرام کا مقصد دیہات کے لوگوں کو اپنی مدد آپ کے اصول کے تحت کام کرنے کی ترغیب دلانا تھا۔ بعد میں اس پروگرام کی جگہ دیہی ورکس پروگرام نے لے لی۔ دیہی ورکس پروگرام کے مقاصد بھی قریباً" وہی تھے جو دیہی زرعی اور صنعتی ترقی کے پروگرام کے تھے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے دیہاتی ترقی کے پروگرام کا طریق کار اہمیت کا حامل ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی مصنوعی کھاد' بیج اور وافر پانی مہیا کیا جائے۔ دیہات کے لیے طبعی اور معاشرتی ڈھانچہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیہاتی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کی رقم 33 فی صد رکھی گئی ہے' جب کہ گزشتہ منصوبہ میں یہ رقم 32 فی صد تھی۔ 55 فی صد دیہات کو بجلی فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ بجلی کی فراہمی سے دیہاتی آبادی کی زندگی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوں گی۔

اس منصوبے میں دیہات میں سڑکوں کی تعمیر کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف 16 فی صد دیہات ایسی سڑکوں پر واقع ہیں جو ہر موسم میں کار آمد رہتی ہیں اور صرف 30 فی صد دیہات کا ہر موسم میں ان سڑکوں سے رابطہ قائم رہتا ہے لیکن باقی دیہات خراب موسم میں ملک کے دوسرے حصوں سے کٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ منصوبے میں اسی پر زور دیا گیا ہے کہ دیہات کو منڈیوں کی سڑکوں کے نزدیک قائم کیا جائے۔ تعمیراتی کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے لوکل کونسلوں کو سڑکوں کی تعمیر کے لیے مشینری فراہم کی جائے۔ جب دیہات کا رابطہ شہروں کے ساتھ قائم ہو جائے گا تو منڈیوں میں زرعی پیداوار زیادہ قیمت پر فروخت کی جا سکے گی۔ سڑکیں دیہاتی علاقوں میں صنعتوں کے قیام میں مددگار ثابت ہوں گی۔ اس طرح دیہی آبادی کو بہتر روزگار کے مواقع میسر آئیں گے۔ منصوبے کا مقصد کاشت کاروں کی آمدنی میں اضافہ کرنا ہے تاکہ وہ خوش حال زندگی بسر کر سکیں۔ ایسی صورت میں دیہاتی آبادی شہروں کا رخ نہیں کرے گی اور شہری و دیہاتی علاقوں کے مابین معاشی مواقع کے عدم توازن میں کمی واقعہ ہو گی۔

اس منصوبے کے تحت لوکل کونسلوں پر ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ دیہی علاقوں میں جملہ بنیادی ضروریات فراہم کریں۔ ان میں پانی مہیا کرنا' بہتر طبی سہولتیں فراہم کرنا اور پرائمری' مڈل اور ثانوی تعلیم کی حالت بہتر بنانا سرفہرست ہیں۔ اگر دیہاتی آبادی کی یہ ضروریات پوری ہو

جائیں اور سماجی خدمت کے متعلقہ ادارے یہ فرائض انجام دیں تو دیہی ترقی کی طرف یہ ایک اہم قدم ہوگا۔

**پانی اور بجلی:** آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی کے دو اہم ذرائع ہیں:

(1) سطحی پانی جو دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے سارا سال حاصل کیا جاتا ہے۔

(2) زیر زمین پانی جو ٹیوب ویل، کنوؤں اور کاریزوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔

آبپاشی کے نظام کا انحصار بڑی حد تک دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے حاصل ہونے والے پانی پر ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ نہری پانی کا قریباً 60 فی صد حصہ مختلف مقامات پر ضائع ہو جاتا ہے جس سے سطحی پانی کی دستیابی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ نجی اور سرکاری ہر دو سطحوں پر کوشش کی جائے کہ پانی ضائع نہ ہونے پائے۔ ٹیوب ویلوں کے ذریعے بھی آبپاشی کی جاتی ہے۔ یہ آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ٹیوب ویلوں کی ایک قسم سکارپ (Scarp) ٹیوب ویل ہے۔ ان ٹیوب ویلوں کے ذریعے سیم زدہ زمین کو قابل کاشت بنانے کے لیے پانی کی سطح کو نیچا کر دیا جاتا ہے۔ سیم و تھور کے اثرات سے پاک ہو کر زمین قابل کاشت ہو جاتی ہے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں آبپاشی کے لیے پانی کے وسائل کو بہتر بنانے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ زرخیز زمینوں کو سیم و تھور کی لعنت سے محفوظ کرنے کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ ان زمینوں پر خاص توجہ دی گئی ہے جن میں زیر زمین سیم کا پانی موجود ہے۔ زمینوں کو بتدریج سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ زمینی پانی کو محفوظ کرنے کے لیے پرانے ٹیوب ویلوں کی جگہ نئے ٹیوب ویل لگانے کی سفارش کی گئی ہے۔ آبپاشی اور نکاس کے موجودہ نظام کی اصلاح کی سفارش کی گئی ہے۔ واٹر مینجمنٹ (Management) پروگرام کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے تاکہ آبی ذرائع سے مکمل فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ایک توسیعی پروگرام کے تحت ان علاقوں میں آبپاشی کی نئی سکیمیں شروع کرنے کی سفارش کی گئی ہے جہاں پانی کی قلت ہے۔ آبی ذخیروں کے لیے نئے تالاب تعمیر کیے جائیں گے تاکہ زیر کاشت رقبہ میں اضافہ ہو سکے۔ پسماندہ علاقوں میں ٹیوب ویل نصب کیے جائیں گے تاکہ ان علاقوں کو آبپاشی کی

سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ ایک جامع منصوبے کے تحت مزید دیہاتوں کو بجلی فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی تاکہ وہ بھی ترقی کے میدان میں بھرپور حصہ لے سکیں۔ مختصراً" یہ کہ آبی وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں تفصیلی پروگرام وضع کیا گیا ہے۔

توانائی: گیس، تیل کوئلہ اور پن بجلی پاکستان میں قوت کے روایتی ذرائع ہیں۔ قریباً" 65 فی صد قوت کی ضروریات ان ذرائع سے پوری کی جاتی ہیں۔ لکڑی اور جانوروں کے گوبر کے استعمال سے باقی ماندہ 35 فی صد ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ تیل اور گیس ملک میں قوت کی قریباً" تین چوتھائی سے زیادہ ضروریات پوری کرتے ہیں۔ گیس نے کسی حد تک کوئلہ کی جگہ لے لی ہے، اور گھریلو ضروریات کے لیے توانائی مہیا کرنے کا بڑا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہمارے ملک میں کوئلے کے ذخائر ہیں تو وافر مقدار میں مگر یہ کوئلہ زیادہ اچھی قسم کا نہیں ہے۔ ملک میں تیل کی پیداوار کی بھی قلت ہے، اس لیے بڑی مقدار میں تیل در آمد کیا جاتا ہے جس پر زرمبادلہ کی کثیر رقم خرچ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کچھ عرصہ سے تیل کی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے کیونکہ بعض جگہوں سے بالخصوص آدھی اور خس خیلی کے مقامات پر تیل دریافت ہوا ہے۔ توقع ہے کہ اس سے ملک میں خرچ ہونے والے تیل کی 10 فی صد ضروریات پوری ہو سکیں گی۔ گزشتہ چند برس سے توانائی کے حصول کے لیے ملک کا انحصار زیادہ تر گیس پر ہو گیا ہے ادھر گیس کے ذخیرے میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں پن بجلی کے استعمال میں اضافہ ہوا ہے، بہرحال گیس کے مزید ذخائر دریافت ہونے کی توقع ہے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں توانائی کو ترقی دینے پر زور دیا گیا ہے تاکہ توانائی کے بحران پر قابو پایا جا سکے۔ اس میں گوبر گیس، شمسی توانائی، ہوائی توانائی اور چھوٹے پن بجلی گھروں کو ترقی دینے کی سفارش کی گئی ہے۔ جوہری توانائی کی ترقی پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے از حد ضروری ہے تاکہ ملک توانائی کی ضروریات سے عہدہ برآہ ہو سکے، لیکن اس ضمن میں بین الاقوامی مخالفت کا بھی سامنا ہے۔ قومی مفاد کی خاطر اس دباؤ کا مقابلہ کرنا ضروری ہے۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبہ میں شعبہ توانائی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کیونکہ جب تک وافر مقدار میں برقی قوت پیدا نہیں کی جائے گی، خاطر خواہ ترقی ممکن نہ ہو گی۔

تعلیم : انسانی وسائل کو ترقی دینے اور معاشی و معاشرتی ترقی کے لیے شعبہ تعلیم میں مناسب سرمایہ کاری نہایت اہم ہے۔ تعلیم اور معاشی و معاشرتی ترقی کے مابین گہرا تعلق ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے تجربات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مجموعی قومی آمدنی میں اضافہ تعلیم کے فروغ سے ہوتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں منصوبہ بندی کرنے والے کچھ عرصے تک تعلیم کی اہمیت سے زیادہ آگاہ نہ ہو سکے' اس لیے تعلیم کے شعبہ کے لیے ضرورت سے کم رقوم مختص کی جاتی رہی ہیں۔ یہ رجحان اب بدل گیا ہے۔ اب ترقی پذیر ممالک شعوری طور پر کوشش کر رہے ہیں کہ مجموعی قومی آمدنی میں سے جس قدر ممکن ہو زیادہ رقوم تعلیم کے شعبہ کو دیں۔ پاکستان بھی تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے' یہی وجہ ہے کہ ساتویں منصوبے میں اس شعبے کو اس کا اصل مقام دیتے ہوئے بہت اہمیت دی گئی ہے۔

پانچویں منصوبے میں تعلیم کے لیے 5.6 بلین روپے اور چھٹے منصوبے میں 19.9 بلین روپے مختص کیے گئے تھے۔ جبکہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں 23.1 بلین روپے رکھے گئے ہیں۔ مجموعی ترقیاتی اخراجات میں تعلیم کے حصے میں 6 فی صد سے اضافہ ہو کر 7 فی صد ہو گیا ہے۔ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ منصوبے میں اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں پرائمری اور ثانوی تعلیم کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل گوشوارے سے اس امر کا اندازہ ہو جائے گا۔

| شعبہ | چھٹے منصوبے کی مختص رقم (ملین روپوں میں) | ساتویں منصوبے کی مختص رقم (ملین روپوں میں) |
|---|---|---|
| پرائمری تعلیمی پروگرام | 7000 | 10128 |
| ثانوی تعلیمی پروگرام | 4125 | 6404 |
| ٹیکنیکل تعلیمی پروگرام | 1315 | 2000 |
| کالج کا تعلیمی پروگرام | 1300 | 615 |
| یونیورسٹی تعلیمی پروگرام | 2100 | 1800 |

منصوبے کے مطابق لازمی تعلیم کے لیے خصوصی کوشش کی جائے گی۔ توقع ہے کہ منصوبے کے آخری سال تک تمام لڑکوں اور لڑکیوں کو جو پہلی جماعت میں داخلے کی عمر کو پہنچ جائیں گے' سکولوں میں داخل کیا جائے گا۔ یہ ایک قابل ستائش مقصد ہے لیکن یہ مقصد اسی

صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ تعلیم ترک کرنے کی موجودہ شرح میں کمی کی جائے۔ اس کے علاوہ ترک تعلیم کے رجحان کو کم کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

پرائمری درجہ میں یہ شرح 30 سے 40 فی صد تک ہے، تعلیم ترک کرنے سے مراد یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں سکول کی آخری جماعت تک پہنچنے سے پہلے ہی ترک تعلیم کر رہے ہیں۔ فرض کریں کہ 100 طالب علم اول جماعت میں داخل ہوتے ہیں، لیکن چالیس طالب علم تعلیم مکمل کیے بغیر سکول چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ امر تعلیمی ضیاع کی عکاسی کرتا ہے۔ ترک تعلیم کے اس تناسب میں کمی کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ دیہاتی لڑکیوں کی تعلیم کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں جن پر قابو پانے کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی گئی ہے۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں پرائمری درجے کی تعلیم کی ترقی کے لیے تفصیلی پروگرام وضع کیا گیا ہے۔

اس پروگرام پر عمل درآمد کے لیے 10.12 بلین روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ پرائمری سکولوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر اشد ضروی ہے کیونکہ سکولوں کی ایک خاصی تعداد باضابطہ عمارتوں کے بغیر چل رہی ہے۔

1972ء کی مردم شماری کے مطابق خواندگی کی شرح 21.7 فی صد تھی جو بڑھ کر 1981ء میں 26.2 فی صد ہو گئی۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے کے مطابق 1993ء تک خواندگی کی شرح 40 فی صد ہو جانے کی توقع ہے بشرطیکہ مالیاتی اور سماجی و معاشی رکاوٹوں پر قابو پا لیا جائے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ خواندگی زندگی کو بہتر بناتی ہے نیز کارکنوں کی حصول علم و تربیت کی صلاحیت میں اضافہ کرتی ہے۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں ثانوی درجہ کی تعلیم کو معیاری اور باعمل بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس منصوبے میں سابقہ معیار تعلیم کو غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے زور دیا گیا ہے کہ مجموعی طور پر سکولوں میں اساتذہ کی کمی کو دور کیا جائے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم اور عملی کام پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اس سلسلے میں اہم نکات یہ ہیں:

(i) لیبارٹریوں، لائبریریوں، سائنسی سامان اور ان سے متعلقہ سٹاف کو بہتر بنایا جائے۔

(ii) نصاب میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جائے۔ اساتذہ کی کمی

کو دُور کرنے کے لیے ایف۔ ایس۔ سی اور بی۔ ایس۔ سی کے طالب علموں سے مدد لی جائے۔

اس طرح ایک اندازے کے مطابق ثانوی سطح پر مزید 40 فی صد طلبہ علم حاصل کر سکیں گے۔

اعلیٰ تعلیم ڈگری کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جائے گی۔ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں مندرجہ ذیل باتوں پر زور دیا گیا ہے۔

(i) اس سطح کے تعلیمی اداروں کو مزید وسعت دینے کی بجائے ان کے معیار کو بہتر بنایا جائے۔

(ii) سائنس اور ٹیکنالوجی کے مضامین پر خاص طور پر زور دیا جائے۔ یونیورسٹیوں میں نصاب' درسی کتب لیبارٹریوں کی حالت اور اساتذہ کے معیار کو بہتر کیا جائے تاکہ ان میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے پروگرام بہتر طور پر چلائے جا سکیں۔

پانچویں پانچ سالہ منصوبے میں عام تعلیمی نظام میں اسلامی تعلیمات کو مربوط کرنے کی کوشش کی گئی اور اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ اب اسلامیات کو پہلی جماعت سے چودھویں جماعت تک لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ اسلامی تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے عربی کو چھٹی سے آٹھویں تک لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں اس کام کو مربوط بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ جملہ نصاب برائے اسلامیات کو قرآنی تعلیمات کے مطابق کرنے اور اساتذہ کو اس سلسلے میں ٹریننگ دینے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی منصوبے کے تحت کراچی' لاہور اور پشاور میں اسلامی مراکز کھولنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ اس کا مقصد مسلمان علما کو موقع فراہم کرنا ہے تاکہ وہ اسلامی تعلیمات کو جدید علوم کے مطابق سمجھ سکیں۔

ساتویں منصوبے میں ان تمام شعبہ جات کو مزید مؤثر بنانے پر زور دیا گیا ہے اور اس سلسلے میں مزید کوششوں کو تیز تر کیا جائے گا۔

**صحت:** پاکستان میں عام شہری کی صحت اور درازی عمر ترقی یافتہ ممالک کے شہریوں کی نسبت کم تر ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بیشتر صورتوں میں نامکمل و ناکافی غذا ملتی ہے نیز

مناسب طبی سہولتیں بھی میسر نہیں۔ شرح اموات 11 افراد فی ہزار ہے۔ بچوں کی شرح اموات 80 فی ہزار ہے' اور زچگی میں شرح اموات 6.8 فی ہزار ہے۔ پاکستان میں صحت کی خراب حالت کے بنیادی اسباب معاشی غربت' ناقص غذا صفائی کا فقدان اور طبی سہولتوں کی غیر مساویانہ تقسیم ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن ان کا استفادہ اس لیے محدود ہے کہ اکثر ہسپتال شہروں میں بنائے گئے۔ بیشتر دیہاتی آبادی کے لیے ڈسپنسریاں تو ہیں مگر ڈاکٹر موجود نہیں ہیں کیونکہ اکثر ڈاکٹر دیہات کے ہسپتالوں اور ڈسپنسریوں میں کام کرنے سے گریزاں ہیں۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں نہ صرف موجودہ سہولیات کو بہتر اور یک جا کیا جائے گا بلکہ امراض کی روک تھام سے متعلق اقدامات کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔ صحت کے جدید نظام کو دیہات میں رائج کیا جائے گا۔ پانچ ہزار سے دس ہزار کی آبادی کے علاج کے لیے صحت کا یونٹ قائم کیا جائے گا۔ ہر یونٹ میں ایک سند یافتہ ڈاکٹر کا تقرر کیا جائے گا۔ اس یونٹ میں آیا کا تقرر بھی کیا جائے گا۔ سکول کے بچوں کے علاج اور معائنے کا بالخصوص انتظام کیا جائے گا۔ اس قسم کے پانچ یا چھے یونٹوں کو دیہی مرکز صحت کے ماتحت کر دیا جائے گا۔ مرکز صحت میں 15 بستروں کا انتظام کیا جائے گا اور ایک لیبارٹری قائم کی جائے گی۔ ایکسرے کرنے اور غیر پیچیدہ سرجری کا بندوبست کیا جائے گا۔ مرکز صحت کا تعلق ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز ہسپتال سے قائم کیا جائے گا جہاں ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے گی۔ ڈسپنسریوں کو بھی علاج کرنے کے لیے ضروری سہولیات بہم پہنچائی جائیں گی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے 13.35 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ جب کہ چھٹے منصوبے میں اس مد کے تحت صرف 4.13 ارب روپے رکھے گئے تھے۔

**صنعت** : کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لیے صنعت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ صنعتی ترقی معیشت کے دیگر شعبوں میں ترقی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ دیہاتی علاقے کی فارغ یا نیم فارغ افرادی قوت بھی صنعت میں کھپ جاتی ہے۔ عوام کی حقیقی آمدن میں اضافے کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی صنعتی اشیاء کا مطالبہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ صنعتی اشیا تیار کر کے زرمبادلہ بھی حاصل کیا جاتا ہے۔

پاکستان کی معاشی منصوبہ بندی کرنے والے صنعت کی اہمیت سے غافل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجموعی ملکی پیداوار میں صنعت کا حصہ 2.6 فی صد رکھا گیا ہے۔ صنعتی اشیا کی برآمدات پاکستان

کی کل برآمدات کا 6.5 فی صد ہیں۔ 1955ء میں منصوبہ بندی کے بعد پاکستان میں صنعتی ترقی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ کوالٹی کی طرف ترغیب دلانے کی البتہ اب بھی ضرورت ہے۔ حکومت پاکستان نے گھریلو صنعت کو تحفظ دینے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ حاصل نہیں ہوا کیونکہ بیشتر صورتوں میں صارفین کو غیر معیاری اشیا گراں قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں۔

1959ء تا 1960ء کے عرصے میں صنعت بڑی حد تک نجی شعبے کے ہاتھ میں تھی۔ اس شعبے کو صنعتی فروغ کے لیے کافی مراعات دی گئیں لیکن نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں ملک کے مختلف طبقات کی آمدنی میں کافی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ سرکاری شعبہ نے ایسی صنعتیں قائم کیں جن پر کافی لاگت آتی تھی' اور پیچیدہ فنی مہارت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ سرکاری شعبہ نے پسماندہ علاقوں میں صنعتیں قائم کیں۔ پاکستان کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے ایسی صنعتیں قائم کرنے میں پیش قدمی کی جن کے قیام کے لیے نجی شعبہ تیار نہ تھا۔ وہ صنعتیں جو پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن نے تیار کیں' بعد میں انھیں نجی شعبہ کو منتقل کر دیا گیا۔ سرکاری شعبہ نے منافع کو پیش نظر نہ رکھا تھا بلکہ معاشی پیداوار کو اپنا مطمح نظر بنایا۔

ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں سرکاری اور نجی شعبہ میں امتزاج کا نیا تصور پیش کیا گیا ہے۔ سرکاری شعبہ ایک نگران کے فرائض سرانجام دے گا نیز ایسا ڈھانچہ ترتیب دینے میں مدد دے گا جو نجی شعبے میں مددگار ثابت ہو۔ سرکاری شعبہ زیادہ تر ایسی صنعتیں قائم کرے گا جن پر بڑی رقوم خرچ ہوں گی اور جن کو قائم کرنے کے لیے نجی شعبہ تیار نہیں ہوگا۔ ایسی صنعتوں کے قیام کے لیے نئی ٹیکنالوجی کی ضرورت ہوتی ہے' نیز پیداواری اشیا کی قیمتیں غیر یقینی ہوتی ہیں۔ انھی وجوہات کی بنا پر نجی شعبہ ایسی صنعتیں قائم کرنے سے گھبراتا ہے۔ حکومت کی موجودہ پالیسی یہ ہے کہ نجی شعبہ کو صنعت میں اہم مقام دیا جائے۔ اسے صنعت کو قومیائے جانے کا خوف نہ ہو اور وہ ملک کی صنعتی ترقی میں بھرپور حصہ لے سکے۔ نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے ساتویں منصوبے میں صنعتوں کو مراعات دی گئی ہیں' تاکہ ان میں مقابلہ کی صلاحیت پیدا ہو۔ صنعتی ترقی کے لیے 9 بلین روپے مختص کیے گئے ہیں۔ نجی شعبہ کی بنا کا انحصار اہلیت اور مقابلہ پر رکھا گیا ہے نہ کہ محض سرکاری تحفظ پر۔ فولاد پر انجینئرنگ کا سامان بنانے والی صنعتوں کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ کراچی میں فولاد کے کارخانے کے قیام نے انجینئرنگ کا سامان بنانے والی صنعتوں کے

قیام کا احساس دلایا ہے۔ کیونکہ انجینئرنگ کے سامان کا مطالبہ مختلف شعبوں مثلاً ریلوے، ٹرانسپورٹ، رسل و رسائل کے محکمے کرتے ہیں۔ ملکی صنعتوں میں استعمال کے لیے بجلی کے سامان اور مشینری کی ضرورت ہو گی، اس لیے اس طرف بھی توجہ دی جائے گی۔ ملک میں اس وقت مندرجہ ذیل اہم صنعتیں قائم ہیں:

شکر سازی: ملک میں شکر تیار کرنے کے 39 کارخانے موجود ہیں، ان کی سالانہ پیداواری صلاحیت ایک ملین ٹن سے کچھ زیادہ ہے۔ ان میں سے 20 صوبہ پنجاب میں 14 صوبہ سندھ میں اور 5 صوبہ سرحد میں قائم ہیں۔ حکومت نے نجی شعبہ کو شکر کے 10 کارخانے لگانے کی اجازت دے دی ہے۔ ان کی مجموعی پیداوار صلاحیت قریباً ایک تہائی ملین ٹن ہو گی۔ ان میں سے 6 صوبہ پنجاب، 3 صوبہ سندھ اور ایک صوبہ سرحد میں لگایا جائے گا۔ گزشتہ کئی سالوں سے حکومت نے شکر درآمد نہیں کی ہے کیونکہ ملک اس میں خود کفیل ہو چکا ہے۔

بناسپتی گھی: اس وقت تقریباً 50 سے زائد کارخانے بناسپتی گھی تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کی پیداواری صلاحیت ملکی ضرورت کے حساب سے کافی ہے۔ اس شعبے میں صورت حال تسلی بخش ہے اور ملک میں اس کی کمی کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ گھی بنانے میں خوردنی تیل استعمال ہوتا ہے۔ بین الاقوامی منڈیوں میں تیل کی قیمت میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں سورج مکھی کی کاشت میں حال ہی میں دلچسپی لی گئی ہے۔ کچھ علاقوں میں خوردنی تیل حاصل کرنے کے لیے سورج مکھی کی کاشت شروع ہو گئی ہے تاکہ پاکستان خوردنی تیل کے بارے میں غیر ممالک پر انحصار نہ کرے۔

سیمنٹ: سرکاری شعبہ میں سیمنٹ کے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت قریباً پانچ ملین ٹن ہے۔ ملکی ضروریات کے پیش نظر کچھ سیمنٹ درآمد بھی کرنا پڑتا ہے۔ سیمنٹ کے مختلف کارخانے سٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کی زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔

کیمیائی کھاد: نائٹروجن کھاد تیار کرنے والے کارخانوں کی سالانہ پیداواری صلاحیت قریبا سوا ملین ٹن ہے، جو ملکی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ فاسفیٹ کھاد تیار کرنے والے کارخانوں کی سالانہ پیداوار ملکی ضروریات کے لیے ناکافی ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت نے نجی شعبہ میں کھاد کے کارخانے لگانے کی اجازت دے دی ہے تاکہ کھاد کی کمی کو دور کیا جا سکے۔

تجارتی شعبہ : پاکستان کی معیشت میں برآمدات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس طرح نہ صرف زرمبادلہ حاصل ہوتا ہے بلکہ ایسی اشیا بھی ملتی ہیں جو معیشت کے فروغ کے لیے ضروری ہیں۔ اشیا کی طلب میں اضافہ ہوتا ہے جس سے صنعتی سرگرمیوں میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے حکومت ایسی پالیسی پر عمل کر رہی ہے جس سے پیداوار میں اضافہ ہو اور برآمدات میں وسعت ملے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کی کوشش کی جا رہی ہے:

(الف) زرعی اور صنعتی شعبوں کی پیدوار میں اضافہ تاکہ فاضل پیداوار برآمد کی جا سکے۔

(ب) برآمدی اشیا پیدا کرنے والی صنعتوں کی حوصلہ افزائی۔

(ج) مختلف اشیا کی مختلف ممالک کو برآمد۔

زرمبادلہ میں اضافے کے لیے حکومت کئی اقدامات کر رہی ہے۔ مختلف برآمدی اشیا پر مراعات دی گئی ہیں۔ ایکسائز ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس میں رعائت اور مشینری کی درآمد پر ڈیوٹی معاف کر دی گئی ہے تاکہ توازن قائم رہے اور پرانی مشینوں کی جگہ بہتر اور جدید مشینیں لگائی جا سکیں۔ برآمدی مالیاتی سکیم وضع کی گئی ہے۔ درآمدات کے مقابلے میں ممکنہ حد تک آزادانہ پالیسی اختیار کی گئی ہے۔ لاہور اور کراچی میں برآمدات کے زون قائم کیے گئے ہیں۔ جنوری 1982ء میں پاکستان نے اپنے روپے کا تعلق ڈالر سے ختم کر لیا۔ یہ بھی دراصل اسی مقصد کے حصول کی ایک کڑی تھی۔

درآمدی پالیسی : برآمدات کو فروغ دینے کے ساتھ بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات اور ملکی معاشی حالات کے مطابق درآمدی پالیسی وضع کی گئی ہے۔ 1989ء - 1990ء کی درآمدی پالیسی کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں:

(1) صنعتی شعبے کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کیا جائے گا اور نئی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کے لیے خام مال اور صنعتی سامان کی فراہمی کی ضمانت دی گئی ہے۔

(2) درآمدی اشیا کی متبادل اشیا بنانے اور برآمدات کو فروغ دینے کی سعی کی جائے گی۔

(3) نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے گی تاکہ وہ قومی معیشت میں سرگرم ہو جائے۔

(4) صنعتی کارکردگی میں اضافہ اور صنعتوں میں خود اعتمادی کی بحالی کے لیے انھیں بین الاقوامی مقابلے کے لیے آمادہ کیا جائے گا۔

(5) اشیائے صرف کی فراہمی میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ قیمتوں میں اضافے کو روکا جا سکے۔

(6) ملکی صنعتوں پر درآمدات کے ضرر رساں اثرات کا سدباب کیا جائے گا۔

(7) متعدد اشیا سے ڈیوٹی اور سیلز ٹیکس ختم کر دیا گیا ہے۔

1989-90ء کے مالی سال کے لیے درآمدات کا اندازہ 6800.6 ملین ڈالر لگایا گیا ہے۔ یہ گزشتہ سال سے 2.8 فیصد کم ہے۔

برآمدات: کچھ برآمدی اشیا ایسی ہیں جن پر پاکستان کی درآمدات کا بھی بڑی حد تک انحصار ہے۔ ان اشیا میں چاول، سوتی دھاگہ، سوتی کپڑا، چمڑا اور قالین شامل ہیں۔ گزشتہ چند سالوں کے عرصے میں متفرق اشیا کی برآمد میں اضافہ ہوا ہے۔ 1989-90ء کے مالی سال میں برآمدات کا ہدف 5000.71 ملین ڈالر مقرر کیا گیا ہے۔

ماہرین کی رائے میں موجودہ تجارتی پالیسی سے تجارتی خسارہ کم کرنے میں مدد ملے گی نیز تجارتی تعلقات وسیع ہوں گے۔

## سوالات

(الف) مختصر جواب دیجیے:

1- پاکستان میں معاشی منصوبہ بندی کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔

2- پانچویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کا تنقیدی جائزہ لیجیے۔

3- چھٹے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کے اہم بنیادی مقاصد لکھیے۔

4- ساتویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کے بارے میں مفصل طور بیان کیجیے۔

5- آٹھویں پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کی تیاری اور مقاصد بیان کیجیے۔

6- درج ذیل شعبوں کی معیشت پاکستان میں جو اہمیت ہے' اس پر نوٹ لکھیے۔

(i) زراعت۔ (ii) دیہی ترقی (iii) تعلیم

(ب) درست کے سامنے ✓ کا نشان لگایئے:

1- پاکستان ایک ____ ملک ہے۔

(ترقی پذیر' ترقی یافتہ' پسماندہ)

2- پاکستان میں افزائش آبادی کی شرح وسائل کی نسبت ____ ہے۔

(کم' بلند' برابر)

3- پہلے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کا آغاز ____ میں ہوا۔

(1947ء' 1955ء' 1957ء)

4- بیس سالہ تناظری ترقیاتی منصوبے کی میعاد ____ تھی۔

(1947ء تا 1967ء' 1950ء تا 1970ء' 1965ء تا 1985ء)

5- چھٹا پانچ سالہ ترقیاتی منصوبہ ____ سے شروع کیا گیا۔

(1977ء' 1980ء' 1983ء)

6- پاکستان کی تقریباً ____ فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔

(63 '70 '80)

7- دیہات میں فی کس آمدنی شہر کی فی کس آمدنی سے ____ ہے۔

(کم' زیادہ' برابر)

8- دیہی زرعی اور صنعتی ترقی کا پروگرام---- میں شروع کیا گیا

(1947ء' 1953ء' 1977ء)

9- ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں تعلیم کے لیے ____ بلین روپے مختص کیے گیے۔

(19.9 '11.4 '23.1)

10- 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں خواندگی کی شرح ____ فی صد ہے۔

(45 '26.2 '21.7)

8

# پاکستان اور عالمی برادری

فی زمانہ کوئی ملک باقی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہ کر اپنی تمام ضروریات پوری نہیں کر سکتا اور نہ ہی اپنے مسائل کو مکمل طور پر حل کر سکتا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے باہمی انحصار کی وجہ سے ہر ملک کو دیگر ممالک سے دو طرفہ' علاقائی اور بین الاقوامی بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے پڑتے ہیں۔ پاکستان دیگر ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نے بڑی طاقتوں کی باہمی آویزشوں سے دامن بچاتے ہوئے دنیا کے قریباً" ہر ملک سے سفارتی روابط قائم کیے ہوئے ہیں۔ ان تعلقات کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے' ان میں اہم درج ذیل ہیں :

(i) اپنی آزادی اور خود مختاری کا تحفظ۔

(ii) دوسروں کی آزادی' خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کا احترام۔

(iii) دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل سے احتراز۔

(iv) اقوام متحدہ کے چارٹر پر سختی سے عمل۔

(v) دنیا میں انسانی حقوق' امن اور آشتی کو فروغ دینا۔

(vi) نسلی امتیاز کی مخالفت اور حق خود ارادیت کی حمایت۔

پاکستان تیسری دنیا کے حقوق اور مفادات کے حفاظت کے لیے پیش پیش رہتا ہے اور بین الاقوامی اقتصادی نظام میں ایسی دور رس تبدیلیوں کے حق میں ہے جس سے دنیا میں اقتصادی

اور سیاسی انصاف کو فروغ ملے۔ پاکستان کئی بین الاقوامی اداروں کا سرگرم ممبر بھی ہے مثلاً"

| | |
|---|---|
| اقوام متحدہ | United Nations (UN) |
| غیر وابستہ ممالک کی تحریک | Non-Aligned Movement (NAM) |
| اسلامی کانفرنس کی تنظیم | Organization of Islamic Council (OIC) |
| علاقائی تعاون برائے ترقی | Regional Co-operation for Development (RCD) |

اس کا نیا نام (Economic Co-operation Organization) یعنی اقتصادی تعاون کی تنظیم ہے۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ایک نمایاں خصوصیّت اسلامی ممالک سے قریبی تعلقات استوار کرنا ہے۔ پاکستان کے تمام آئینوں میں اسلامی ممالک سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ہماری حکومت کی کوشش رہی ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی ممالک سے برادرانہ تعلقات رکھے جائیں۔ پاکستان نے ہمیشہ اسلامی ممالک کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھا ہے اور ان کے حل کے لیے حتی المقدور تعاون کیا ہے۔ اسلامی دنیا کے مسائل کو حل کرنے کی کوششوں میں بین الاقوامی سطح پر پاکستان بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ پاکستان نے اسرائیل کے مقابلے میں عربوں کا ہمیشہ ساتھ دیا ہے۔ فلسطینیوں کے حقوق اور ان کے قومی تشخّص کی ہمیشہ حمایت کی ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی کانفرنس کے قیام اور اس کو مؤثر بنانے میں بھی پاکستان نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

## اقوام متحدہ (UN)

دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) کی ہولناکیوں کے پس منظر میں دنیا کے چند بڑے سیاسی قائدین نے کافی غور و خوض اور باہمی مشورہ کے بعد اور چند دیگر ممالک کی رضامندی سے 24/ اکتوبر 1945ء کو اقوام متحدہ کی داغ بیل ڈالی تاکہ آنے والی نسلوں کو جنگ کے شعلوں سے محفوظ رکھا جا سکے۔

اقوام متحدہ کے چارٹر کے مطابق ادارے کے اہم مقاصد درج ذیل ہیں:

1- بین الاقوامی امن اور سلامتی قائم کرنا۔

2- مشترکہ طور پر ایسے اقدامات کرنا جن سے عالمی امن کو خطرات کم ہوں، جارحانہ اقدامات کو روکا جا سکے اور بین الاقوامی تنازعات کو انصاف اور بین الاقوامی قوانین کے مطابق طے کیا جا سکے۔

3- ایک دوسرے کی آزادی و خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کا احترام کرتے ہوئے برابر کی بنیاد پر دوستانہ تعلقات استوار کرنا، ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کرنا۔

4- اقتصادی، معاشرتی، ثقافتی اور دوسرے انسانی مسائل کو حل کرنے کے لیے بین الاقوامی تعاون کو بڑھانا اور رنگ، زبان، مذہب اور جنس کی تمیز کیے بغیر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام کرنا۔

5- درج بالا مقاصد کے حصول کے لیے کیے گئے اقدامات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مرکزی کردار ادا کرنا۔

اقوام متحدہ سب سے بڑا بین الاقوامی ادارہ ہے۔ ستمبر ۱۹۹۶ء تک اس کے ممبر ممالک کی تعداد 186 تھی جو کہ دنیا کے ہر خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے چھے بنیادی ادارے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ جنرل اسمبلی، سلامتی کونسل، اقتصادی اور معاشرتی کونسل، تولیتی کونسل، سیکرٹریٹ اور عالمی عدالت انصاف۔ اس کے علاوہ اقوام متحدہ کے دو درجن سے زیادہ مخصوص ادارے ہیں جو بنی نوع انسان کی قابل قدر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور ادارے یہ ہیں:-

| | |
|---|---|
| ادارہ خوراک و زراعت | **Food and Agriculture Organization (FAO)** |
| عالمی ادارہ صحت | **World Health Organization (WHO)** |
| بچوں کا عالمی فنڈ | **United Nations International Children Emergency Fund (UNICEF)** |
| بین الاقوامی تعلیمی سائنسی و ثقافتی ادارہ | **United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization (UNESCO)** |

| | |
|---|---|
| پناہ گزینوں کے لیے اقوامِ متحدہ کا ہائی کمشنر | United Nations High Commissioner for Refugees (UNHCR) |
| بین الاقوامی ادارہ محنت | International Labour Organization (ILO) |
| عالمی بینک | World Bank |

قیام پاکستان کے صرف ڈیڑھ ماہ بعد 30 ستمبر 1947ء کو پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر بنا۔ اس روز سے پاکستان اقوام متحدہ کی کارروائیوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہا ہے اور اس ادارے کو فعال بنانے میں کوشاں ہے۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے مؤثر کردار کا چار پہلوؤں سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اول : پاکستان اقوام متحدہ کے مقاصد سے مکمل اتفاق کرتا ہے، یہاں تک کہ یہ اصول اور مقاصد، پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اہم ستونوں میں سے ہیں۔ پاکستان کی کوشش رہی ہے کہ بین الاقوامی اور علاقائی تنازعات کو اقوام متحدہ کے اصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے تاکہ عالمی سطح پر امن و آشتی کو فروغ ملے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم اپنے ذرائع کو اسلحہ کی خرید اور جنگ و جدل کی بجائے عوامی فلاح و بہبود پر صرف کر سکیں گے۔

دوم : پاکستان نے اقوام متحدہ کی مختلف قراردادوں اور فیصلوں کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور دیگر ممبران کو ایسا کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری حکومت نے اقوام متحدہ کی ان تمام کوششوں کی حمایت کی ہے جو اس کے چارٹر کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کی جاتی رہی ہیں۔ دنیا بں نسلی امتیاز ختم کرنے، محکوم قوموں کی آزادی اور اقتصادی و معاشرتی ترقی کے سلسلے میں اقوام تحدہ کی کوششوں میں پاکستان بھرپور حصہ لے رہا ہے۔

سوم : پاکستان نے اقوام متحدہ کے بنیادی اور مخصوص اداروں کی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جنرل اسمبلی کے عمومی اور خصوصی اجلاسوں میں پاکستان کے مندوبین نے عالمی مسائل پر اپنے نقطہ نظر کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ پاکستان کے ایک مندوب کو جنرل اسمبلی کی صدارت کا اعزاز بھی ملا۔ پاکستان، سلامتی کونسل کا کئی بار غیر مستقل رکن منتخب ہوا۔ اسی طرح اقتصادی اور معاشرتی کونسل نیز تولیتی کونسل کی کارروائیوں میں پاکستان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اقوام متحدہ کے سیکریٹریٹ میں پاکستانیوں کی ایک معقول تعداد کام کر رہی ہے۔ پاکستان کے ایک سابق وزیر خارجہ نے نو سال تک عالمی عدالت انصاف کے جج کے فرائض سرانجام دیے ہیں۔

چہارم: جب ہالینڈ نے مغربی اریان کو انڈونیشیا کے حوالے کرنے پر رضا مندی کا اظہار کیا تو پاکستانی فوج کے دستے نے اقوام متحدہ کی امن فوج کی حیثیت سے عبوری مدت کے لیے مغربی اریان میں امن و امان قائم رکھنے کے فرائض سرانجام دیے۔ اس طرح اقوام متحدہ کی ان کوششوں کو تقویت ملی جو وہ عالمی امن کو فروغ دینے کے لیے کر رہی ہے۔

اقوام متحدہ کے مختلف مخصوص ادارے پاکستان میں ترقی اور معاشرتی بہبود کے بہت سے منصوبوں میں اقتصادی اور فنی امداد دے رہے ہیں۔ ان اداروں میں عالمی خوراک کا پروگرام' پناہ گزینوں کے لیے اقوام متحدہ کا ہائی کمشنر' اقوام متحدہ کا بچوں کا فنڈ' عالمی ادارہ صحت اور اقوام متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (United Nations Development Programme (UNDP قابل ذکر ہیں۔ ان کے تعاون سے کافی منصوبے مکمل کیے گئے ہیں اور کئی دوسرے منصوبوں پر کام جاری ہے۔

کشمیر کے تنازعے کے سلسلے میں پاکستان کو اقوام متحدہ سے کافی مایوسی ہوئی ہے۔ یہ مسئلہ 1948ء سے اقوام متحدہ کے سامنے ہے۔ سلامتی کونسل نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے قراردادیں منظور کیں کہ کشمیری عوام' استصواب رائے سے ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ ان میں سے کسی قرارداد پر عمل نہ ہو سکا۔ اقوام متحدہ نے کئی کمیشن برصغیر بھیجے' لیکن اس مسئلے کے حل کی طرف کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بھارت نے سلامتی کونسل کی قراردادوں کو یکسر نظر انداز کر کے ریاست جموں و کشمیر میں استصواب رائے کروانے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے یہ مسئلہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اقوام متحدہ جیسا عالمی ادارہ' بھارت کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا کہ وہ کشمیریوں کو حق خود ارادیت کے استعمال کا موقع دے کر اس وعدے کو پورا کرتا جو بھارت نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں کیا تھا۔

# غیر وابستہ ممالک کی تحریک (N-A-M)

یہ ایک اہم بین الاقوامی انجمن ہے۔ اس کی جڑیں اس کانفرنس سے جا ملتی ہیں جو اپریل 1955ء میں انڈونیشیا کے شہر بنڈونگ میں منعقد ہوئی۔ پاکستان نے اس کانفرنس میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔ اس کانفرنس کا بڑا مقصد ان ممالک کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرنا تھا جو دونوں بڑی طاقتوں (امریکہ - روس) میں سے کسی کے حاشیہ بردار نہیں بننا چاہتے تھے۔ اس کانفرنس میں شریک ممالک نے باہمی تعلقات کے پانچ اصول منظور کیے، جنھیں پنچ شیلا کے نام سے موسوم کیا گیا۔ وہ اصول ہیں۔ (i) ایک دوسرے کے اقتدار اعلیٰ اور علاقائی خود مختاری کا احترام (ii) جارحیت سے پرہیز (iii) ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا (iv) برابری اور باہمی افادیت (v) پر امن بقائے باہمی۔

1961ء میں یوگوسلاویہ کے شہر بلغراد میں 25 غیر وابستہ ممالک کی پہلی کانفرنس منعقد ہوئی، جس نے بنڈونگ کانفرنس کی قراردادوں اور پنچ شیلا کے اصولوں کی بنیاد پر غیر وابستہ ممالک کی تحریک کو باقاعدہ تنظیم کے طور پر قائم کیا۔ بلغراد کانفرنس میں منظور ہونے والی قراردادوں کے ذریعے غیر وابستہ ممالک کی تحریک نے محکوم قوموں کی آزادی، غیر ملکی فوجی اڈوں کے خاتمے اور تخفیف اسلحہ کی حمایت کی۔ اس کے علاوہ چند امیر ممالک اور تیسری دنیا کے غریب ممالک کے مابین اقتصادی تفاوت اور معیار زندگی میں فرق کو کم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

غیر وابستہ ممالک کے سربراہان مملکت کی پہلی کانفرنس (بلغراد کانفرنس) کے بعد دیگر کانفرنسیں ان مقامات پر منعقد ہوئیں: دوسری کانفرنس 1964ء میں قاہرہ (مصر): تیسری کانفرنس 1970ء میں لوساکا (زمبیا): چوتھی کانفرنس 1974ء میں الجیرز (الجیریا): پانچویں کانفرنس 1976ء میں کولمبو (سری لنکا): چھٹی کانفرنس 1979ء میں ہوانا (کیوبا): ساتویں کانفرنس 1983ء میں نئی دہلی (بھارت)، آٹھویں کانفرنس 1986ء میں ہرارے (زمبابوے)، نویں کانفرنس 1989ء میں بلغراد (یوگوسلاویہ)، دسویں کانفرنس 1992ء میں جکارتہ (انڈونیشیا) اور گیارویں کانفرنس 1995ء میں کارتاہینا (کولمبیا)

پاکستان نے اگرچہ بنڈونگ کانفرنس میں اہم کردار ادا کیا لیکن غیر وابستہ تحریک کے باقاعدہ قیام کے وقت پاکستان اس میں شامل نہ ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بھارت اور افغانستان کی طرف سے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان نے امریکہ سے ایک دفاعی معاہدہ۔ سیٹو South East Asia Treaty Organization (SEATO) اور معاہدہ بغداد (بعد میں اس کا نام سینٹو رکھا گیا) Central Treaty Organization (CENTO) میں شمولیت اختیار کر کے امریکہ اور دیگر مغربی ممالک سے فوجی امداد اور تعاون کا طریقہ اپنایا۔

1960ء کے عشرے میں بدلتے ہوئے بین الاقوامی حالات کی وجہ سے پاکستان کی حکومت نے محسوس کیا کہ مغربی ممالک پر اپنے انحصار کو کم کر کے اپنے تعلقات کا دائرہ وسیع کرنا چاہیے۔ اس بات کا زیادہ احساس 1965ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران ہوا جب امریکہ اور مغربی الحاقی ممالک نے نہ صرف پاکستان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا بلکہ اسلحہ کی ترسیل پر پابندی لگا دی۔ پاکستان نے مغربی ممالک سے وابستگی کی خارجہ پالیسی پر بتدریج نظرثانی کر کے آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اس رجحان کو 1971ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ کے بعد مزید فروغ ملا کیونکہ 1965ء کی جنگ کی طرح 1971ء کی پاکستان اور بھارت کی جنگ کے دوران میں بھی مغربی ممالک نے عملی امداد کرنے سے انکار کر دیا۔ پاکستان نے پہلے سیٹو (SEATO) اور پھر سینٹو (CENTO) کو خیرباد کہا۔

پاکستان کی خارجہ پالیسی کا ہمیشہ اصول رہا ہے کہ بڑی طاقتوں کی باہمی آویزش سے دور رہ کر تمام ممالک سے دو طرفہ بنیادوں پر دوستانہ تعلقات استوار کیے جائیں۔ اس طرح غیر وابستہ ممالک کی تحریک کا باقاعدہ ممبر نہ ہونے کے باوجود پاکستان ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہے کہ اس تحریک کے بنیادی اصولوں پر عمل کرے۔

1976ء میں غیر وابستہ ممالک کے سربراہوں کی پانچویں کانفرنس میں پاکستان نے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی۔ تین سال بعد 1979ء میں ہوانا میں منعقد ہونے والی چھٹی کانفرنس کے موقع پر پاکستان اس تحریک کا باقاعدہ ممبر بن گیا۔ اب پاکستان غیر وابستہ ممالک کی تحریک کی سفارتی سرگرمیوں میں سرگرمی سے حصہ لیتا ہے اور اس کے ممبر ممالک کے سیاسی' اقتصادی اور دیگر مسائل کی نہایت مؤثر طور پر وکالت کرتا ہے۔

ساتویں سربراہی کانفرنس (1983ء) میں پاکستان نے افغانستان میں اندرونی شورش اور روسی فوج کی مسلسل موجودگی سے پیدا شدہ صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلاً" روشنی ڈالی۔ اس کانفرنس میں موجود بیشتر مندوبین نے ان معاملات پر پاکستان کے موقف کی حمایت کی۔ آٹھویں کانفرنس 1986ء کے موقع پر پاکستان نے مسئلہ افغانستان کے سیاسی حل کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ نویں کانفرنس بلغراد میں 1989ء میں منعقد ہوئی جس میں افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کو اچھا قدم قرار دیتے ہوئے دیگر متعلقہ مسائل کے حل پر زور دیا گیا۔ دسویں کانفرنس 1992 میں جکارتا میں منعقد ہوئی جس میں ان سیاسی اور اقتصادی مسائل کا جائزہ لیا گیا جو غیر وابستہ ممالک کو درپیش تھے۔ بوسنیا ہرزگوینیا کے مسئلہ' کویت پر عراق کا حملہ اور بعد کی صورت حال' اقوام متحدہ کے نظام میں تبدیلی کی ضرورت اور فلسطینیوں کے حقوق کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔

گیارہویں کانفرنس 1995ء میں کارتاہینا میں منعقد ہوئی اس موقعہ پر عالمی سرد جنگ کے خاتمہ کے بعد حالات کے پس منظر میں رکن ممالک کے مسائل کا جائزہ لیا گیا۔ سیاسی اور اقتصادی مسائل کے حل پر زور دیا گیا اور حق خود ارادیت کے اصول کو دوہرایا گیا۔ اقوام متحدہ کے نظام میں تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ کیا گیا تاکہ اسے زیادہ جمہوری اور مساوات کا ہم آہنگ بنایا جاسکے۔

## اسلامی کانفرنس کی تنظیم (O.I.C)

مسلمانان عالم کی دیرینہ خواہش تھی کہ ایک ایسا پلیٹ فارم قائم کیا جائے جس پر تمام اسلامی ممالک اکھٹے ہو کر اپنے مشترکہ مسائل کا حل تلاش کریں' باہمی اخوت کو بڑھائیں اور عالم اسلام کو درپیش بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔ اس مقصد کے حصول کی طرف واضح قدم اس وقت اٹھایا گیا جب اگست 1969ء میں مقبوضہ بیت المقدس میں واقع مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کا واقعہ ہوا۔ عرب وزرائے خارجہ کی کانفرنس نے اس سانحہ پر غور کرنے کے بعد تجویز پیش کی کہ اس واقعہ سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے اسلامی

ممالک کے سربراہان ریاست و حکومت کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابتدائی اقدامات کرنے کی ذمہ داری سعودی عرب اور مراکش کے وزرائے خارجہ کے سپرد کی گئی۔ انھوں نے باہمی مشورے سے ایک سات رکنی کمیٹی بنائی تاکہ اسلامی سربراہی کانفرنس منعقد کی جا سکے۔ پاکستان اس کمیٹی کا رکن تھا۔ اس کمیٹی نے اسلامی ممالک کی حکومتوں سے مشورے کے بعد ستمبر 1969ء میں اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح اسلامی کانفرنس کی داغ بیل پڑی۔

اسلامی کانفرنس کا سب سے اعلیٰ ادارہ سربراہوں کی کانفرنس ہے۔ اسلامی کانفرنس منعقدہ 1981ء کے فیصلے کے مطابق اب سربراہوں کی کانفرنس ہر تین سال بعد ہوتی ہے۔ دوسرا اہم ادارہ وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہے جس کا سال میں کم از کم ایک اجلاس ہوتا ہے۔ اگست 1991ء تک وزرائے خارجہ کے 20 باقاعدہ اجلاس منعقد ہوئے۔ اس کے علاوہ وزرائے خارجہ کے خصوصی اور غیر معمولی اجلاس بھی ہوتے رہتے ہیں۔ پاکستان میں اب تک وزرائے خارجہ کے تین اجلاس ہو چکے ہیں۔

اسلامی کانفرنس کا صدر دفتر سعودی عرب کے شہر جدہ میں قائم کیا گیا ہے جس کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ایک سیکرٹری جنرل کے سپرد ہے۔ اسلامی کانفرنس نے کئی ذیلی تنظیمیں قائم کی ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہے:

1- اسلامی ترقیاتی بنک۔
2- بین الاقوامی خبر رساں ایجنسی۔
3- اسلامی ریاستوں کی براڈ کاسٹنگ کی تنظیم۔
4- اسلامی ممالک کے دارالخلافوں کی تنظیم۔
5- اسلامی اتحاد فنڈ۔
6- القدس فنڈ۔

اسلامی عدالت انصاف قائم کرنے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

**اسلامی کانفرنس کی تفصیلات:** اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی پہلی سربراہی کانفرنس ستمبر 1969ء میں مراکش کے صدر مقام رباط میں منعقد ہوئی جس میں 24 مسلم ممالک نے شرکت کی۔ اس

کانفرنس میں مسجد اقصیٰ میں آتشزدگی کے واقعہ اور عرب اسرائیل تنازعہ پر غور کیا گیا' نیز اسلامی ممالک میں قریبی تعلقات کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

مسلم ممالک کی دوسری سربراہی کانفرنس فروری 1974ء میں لاہور میں منعقد ہوئی اس کا انعقاد سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو (مرحوم) نے کیا۔ جس میں چالیس وفود نے شرکت کی۔ جن میں لیبیا کے صدر کرنل قذافی اور سعودی عرب کے شاہ فیصل (مرحوم) نمایاں تھے۔ لاہور میں اس کانفرنس کا انعقاد پاکستان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اتنی تعداد میں مسلم ممالک کے سربراہان ریاست و حکومت یہاں تشریف لائے۔ اس کانفرنس میں عالم اسلام کو درپیش جن مسائل پر بالخصوص غور کیا گیا' ان میں سے چند اہم یہ تھے :

(i) مشرق وسطیٰ کا مسئلہ خصوصاً" فلسطینیوں کے حقوق کا مسئلہ۔

(ii) یروشلم اور عربوں کے دیگر مقبوضہ علاقوں سے اسرائیل کا اخراج۔

(iii) مسلم دنیا میں غربت و افلاس اور جہالت کے خاتمہ کے لیے اقدامات۔

(iv) ترقی یافتہ ممالک کے ہاتھوں ترقی پذیر ممالک کے استحصال کا خاتمہ۔

(v) آپس میں دوستی اور تعاون کی ضرورت۔

تیسری سربراہی کانفرنس سعودی عرب کے شہر طائف میں جنوری 1981ء میں منعقد ہوئی۔ 38 ممبران اور کئی مبصرین نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک اعلامیہ جاری کیا گیا جسے اعلان مکہ کا نام دیا گیا۔ اس اعلان میں دنیائے اسلام کو درپیش مسائل کا تفصیلی جائزہ لے کر انھیں انصاف' اسلامی بھائی چارہ اور دیگر ممالک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کی بنیاد پر پرامن طریقے سے حل کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ ایران اور عراق کی آپس میں 1980ء سے ہونے والی جنگ کے خاتمے' مسئلہ افغانستان کے سیاسی حل' مسئلہ فلسطین کو طے کرنے اور مقبوضہ عرب علاقوں کو اسرائیل کے قبضہ سے واگزار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ اس کانفرنس میں متفقہ طور پر طے کیا گیا کہ دفاعی میدان میں اسلامی ممالک میں تعاون بڑھانے کے لیے سیکریٹریٹ میں فوجی شعبہ قائم کیا جائے۔

چوتھی سربراہی کانفرنس جنوری 1984ء میں مراکش کے شہر کاسابلانکا میں منعقد ہوئی جس میں 42 ممبران اور کچھ مبصرین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کے موقع پر ان حالات و واقعات کا خصوصیت سے اور تفصیلاً" جائزہ لیا گیا جو تیسری سربراہی کانفرنس 1981ء اور چوتھی سربراہی

ساتویں سربراہی کانفرنس دسمبر 1994ء میں مراکش کے شہر کاسابلانکا میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں کئی قراردادیں منظور کی گئیں جن کا تعلق بوسنیا ہرزگوینا، کشمیر، فلسطین، اور دیگر کئی مسائل سے تھا۔ بین الاقوامی سطح پر دہشت گردی کی مذمت کی گئی مسلمانوں کو درپیش اقتصادی مسائل اور مشکلات کا جائزہ بھی لیا گیا۔ ان کو حل کرنے کے لئے باہمی مشورہ، اسلامی بھائی چارہ اور پرامن ذرائع کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

اسلامی ممالک کے سربراہوں اور وزرائے خارجہ کی کانفرنسوں نے اسلامی دنیا پر اچھے اثرات مرتب کیے ہیں۔ تمام اسلامی ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے مسائل پر غور و فکر کرنے اور اتحاد عالم اسلامی کو فروغ دینے کے مواقع ملے ہیں۔ ان کانفرنسوں کی قراردادوں کے مطابق اسلامی ممالک نہایت انہماک سے اسرائیلی جارحیت کے اثرات کو ختم کرنے، مقبوضہ عرب علاقوں کی بازیابی اور فلسطینیوں کی قومی حیثیت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کروانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مختلف بین الاقوامی اداروں میں اب مسلمانوں کی آواز زیادہ مؤثر ہو گئی ہے۔ اقتصادی میدان میں اسلامی کانفرنسوں کے فیصلوں کی روشنی میں تیل کی دولت سے مالا مال مسلمان ممالک، غریب ممالک کو بہت مفید امداد مہیا کر رہے ہیں تاکہ ان ممالک میں ترقی کی رفتار کو تیز کیا جا سکے۔

پاکستان ہمیشہ مسلم ملت کے تصور کا علمبردار رہا ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سے پاکستان نے مسلم ممالک سے قریبی تعلقات استوار کیے تاکہ تمام اسلامی ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لا کر مسلمانوں کی منتشر قوتوں کو یکجا کیا جا سکے۔ لہذا جب پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس بلانے کا فیصلہ کیا گیا تو پاکستان نے اس کی تیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دوسری سربراہی کانفرنس میں پاکستان نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔ تیسری اور چوتھی سربراہی کانفرنسوں میں پاکستان سفارتی سطح پر بہت سرگرم رہا۔ پندرھویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر 1980ء میں پاکستان کے صدر نے اسلامی کانفرنس کے نمائندہ کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کیا۔ پاکستان کے لیے یہ ایک اعزاز ہے۔ ایران اور عراق کے مابین جنگ کے خاتمے کے لیے جو امن کمیٹی بنائی گئی ہے، پاکستان اس کا بھی ممبر ہے۔

افغانستان میں خانہ جنگی اور روس کی فوجی مداخلت پر اسلامی کانفرنس نے پاکستان کے موقف کی بھرپور حمایت کی ہے۔ مسئلہ افغانستان کے سلسلے میں ایک اہم فیصلہ افغانستان کی رکنیت کی معطلی ہے کیونکہ ممبر ممالک کا خیال ہے کہ افغانستان کی موجودہ حکومت افغان عوام کی نمائندگی کی مجاز نہیں ہے کیونکہ اس کے قیام میں افغان عوام کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اسلامی کانفرنس کے کافی ممالک نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت پاکستان میں موجود افغان مہاجرین کی امداد کے لیے مالی امداد' خوراک' ادویات' خیمے اور دوسرا ضروری سامان مہیا کیا ہے۔

## علاقائی تعاون برائے ترقی (E-C-O)

ابتداً جولائی 1964ء میں ایران' پاکستان' اور ترکی نے باہمی رضامندی سے علاقائی تعاون برائے ترقی کی بنیادی رکھی۔ اب اس تنظیم کا نیا نام اقتصادی تعاون کی تنظیم Economic Co-operation Organization ہے۔ ان تینوں ہمسایہ ممالک میں صدیوں پرانے مذہبی' تہذیبی اور ثقافتی روابط ہیں۔ اس تنظیم کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اقتصادی' صنعتی' تجارتی اور تعلیمی میدانوں میں ان تینوں ممالک کے موجودہ تعلقات میں وسعت پیدا کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کرنا:

1- ایران' پاکستان اور ترکی کے مابین تجارت اور اشیاء کی آزادانہ نقل و حمل کو فروغ دینا۔

2- مشترکہ مقاصد کے منصوبوں کی تیاری اور ان پر عمل در آمد کرنا۔

3- ممبر ممالک کے مابین ڈاک اور تار اسی شرح کا نفاذ کرنا جو ان کے اندرون ملک نافذ ہے۔

4- تینوں ممالک کے ایوان ہائے تجارت میں قریبی روابط قائم کرنا تاکہ ایک مشترکہ ایوان تجارت کا قیام ممکن ہو سکے۔

5- تینوں ممالک کے مابین ذرائع رسل و رسائل کو بہتر بنانا۔

اس سلسلے میں سڑکیں بنانا' ڈاک اور تار کی سہولتیں بڑھانا' ریلوے کے نظام کو بہتر

کرنا شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہوائی سفر کی سہولتیں اور بالآخر تینوں ممالک کے اشتراک سے ایک اچھی اور مضبوط ہوائی کمپنی بنانا بھی اس تعاون کا حصہ ہے۔

6- جہاز رانی کے میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا اور ایک مشترکہ جہاز راں کمپنی کا قیام عمل میں لانا۔

7- تینوں ممالک میں سیر و سیاحت کو فروغ دینا اور ویزا سسٹم کو ختم کرنا۔

8- صنعتی اور ٹیکنیکل میدان میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا۔

9- ثقافتی اور علمی میدانوں میں قریبی تعلقات استوار کرنا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک دوسرے کے طلبہ کو وظائف اور دوسری ضروری سہولتیں مہیا کرنا۔ دوستی اور تعاون کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے ایک دوسرے کے ممالک میں ثقافتی مراکز قائم کرنا اور ثقافتی وفود کے تبادلوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

علاقائی تعاون برائے ترقی کے انتظامی ڈھانچے کی سب سے اعلیٰ تنظیم وزرائے خارجہ یا دیگر نامزد وزرا پر مشتمل وزارتی کونسل ہے جو تمام اہم امور کے فیصلے کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک علاقائی منصوبہ بندی کونسل بھی قائم کی گئی ہے جو ممبر ممالک کے منصوبہ بندی کے عمل میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی سفارش کرتی ہے۔ علاقائی منصوبہ بندی کونسل تینوں ممالک کے منصوبہ بندی کے شعبوں کے اعلیٰ ترین افسران پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کے تحت چند ذیلی کمیٹیاں بھی کام کرتی ہیں۔ اس تنظیم کا سیکریٹریٹ تہران میں ہے جو ایک سیکریٹری جنرل، چند ڈپٹی سیکریٹری جنرل اور ماتحت عملہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً ان ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس کا انعقاد بھی ہوتا ہے۔

علاقائی تعاون برائے ترقی نے مشترکہ مقاصد کے لیے منصوبوں پر عمل درآمد کیا۔ جن میدانوں میں تیزی سے تعاون بڑھا، ان میں تجارت، ذرائع نقل و حمل، سیر و سیاحت، بینکنگ، بیمہ، جہاز رانی اور ڈاک و تار قابل ذکر ہیں۔ تینوں ممالک کے مابین خشکی کے راستے سفر کی سہولتوں کو بہتر کرنے کے لیے علاقائی تعاون برائے ترقی کی شاہراہ تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ شاہراہ کراچی کو تہران اور انقرہ سے ملا دے گی۔

صنعتی میدان میں تعاون کو فروغ دینے کے لیے پہلے منصوبے کے طور پر بیس صنعتوں کو چنا گیا ہے۔ ان میں سے قابل ذکر یہ ہیں : الیکٹرانکس، ادویات، آئرن اور سٹیل، کان کنی، کار سازی، جہاز سازی، کھاد اور زراعت میں استعمال ہونے والے آلات۔ ایک مشترکہ جہاز راں کمپنی قائم ہو چکی ہے۔ مشترکہ بنیادوں پر بیمہ کمپنیوں کا قیام بھی عمل میں لایا گیا ہے۔ ڈاک اور تار کی شرح کم کی گئی ہے۔ تینوں ممالک کے نشر و اشاعت کے ادارے اور خبر رساں ایجنسیاں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔ طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔

1979ء میں ایران میں اسلامی انقلاب کے بعد ایرانی حکومت کی تمام تر توجہ اپنے اندرونی مسائل کی طرف اتنی مبذول ہوئی کہ وہ علاقائی تعاون برائے ترقی کے ادارہ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دے سکی۔ یہ سلسلہ چند سال جاری رہا۔ 1984ء میں ایران نے اس تنظیم کو دوبارہ فعال بنانے کے لیے پاکستان اور ترکی کی طرف رجوع کیا۔ ان دونوں ممالک نے ایران کے خیال سے اتفاق کیا۔ اس ادارہ کو دوبارہ فعال بنانے کے لیے آر۔ سی۔ ڈی کے سیکرٹری جنرل نے ممبر ممالک کے دورے کر کے احکام سے رابطہ قائم کیا۔ اس گفت و شنید کے بعد 1985ء میں اس تنظیم کو نیا نام اقتصادی تعاون کی تنظیم (Economic Cooperation Organization) یا ECO نام دے کر نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ 1992ء میں افغانستان اور وسط ایشیا کی چھ ریاستوں نے ای۔ سی۔ او میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ وسط ایشیا کی ان ریاستوں کے نام یہ ہیں۔ آزربائیجان، ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، کرغزستان اور قزاقستان۔ اس طرح تنظیم کے ممبران کی تعداد دس ہو گئی۔ شمالی قبرص کی ترک جمہوریہ Turkish Republic of North Cyprus کو اس تنظیم سے منسلک کیا گیا لیکن اسے باقاعدہ رکنیت نہیں دی گئی۔

اقتصادی تعاون کی تنظیم کے وزارتی سطح کے اجلاسوں کے علاوہ 1992ء سے ممبر ممالک کے سربراہی اجلاس بھی ہوتے ہیں۔

اب تک یہ اجلاس تہران (فروری 1992ء)، استنبول (جولائی 1993ء) اور اسلام آباد (مارچ 1995ء) میں منعقد ہوئے۔

پاکستان یہ سمجھتا ہے کہ اقتصادی، صنعتی تجارتی اور ثقافتی میدانوں میں ان برادر ممالک

ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مزید برآں ان میدانوں میں تعاون بڑھانے سے نہ صرف اقتصادی ترقی کی رفتار تیز ہو گی اور تینوں ممالک کے عوام کو فائدہ پہنچے گا بلکہ وحدت ملت اسلامیہ کے تصور کو بھی فروغ ملے گا۔

# سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے جامع جواب دیجیے:

1- پاکستان کی خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول کون کون سے ہیں؟

2- اقوام متحدہ کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس کے بنیادی مقاصد کون کون سے ہیں؟ نیز اس کے پانچ اداروں کے نام لکھیے۔

3- غیر وابستہ ممالک کی تحریک پر جامع نوٹ لکھیے۔

4- اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا ایک مقصد یہ تھا کہ اسلامی ممالک اکٹھے ہو کر مشترکہ مسائل کو حل کریں، باہمی اخوت بڑھائیں اور عالم اسلام کو درپیش بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کریں۔ آپ بتائیں کہ یہ تنظیم اپنے عزائم میں کس حد تک کامیاب ہوئی۔

5- علاقائی تعاون برائے ترقی میں ایران، پاکستان اور ترکی کے مابین تعاون کو کس حد تک فروغ دیا گیا ہے۔

(ب) درست کے آگے ✓ کے نشان لگایئے:

(i) پاکستان کی خارجہ پالیسی کی ایک نمایاں خصوصیت اسلامی ممالک سے تعلقات استوار کرنا ہے۔

(ii) UNESCO یونیسکو بچوں کے عالمی فنڈ کا مخفف ہے۔

(iii) آئی۔ ایل۔ او بین الاقوامی ادارہ صحت کا مخفف ہے۔

(iv) پنج شیلا کے نام سے منسوب اصول اسلامی کانفرنس کے قیام کا باعث بنے۔

(v) اسلامی کانفرنس کی تنظیم کا مقصد بڑی طاقتوں کے درمیان طاقت کے توازن کو برقرار رکھنا ہے۔

(vi) اقوام متحدہ کی داغ بیل ——— میں ڈالی گئی۔

(1919ء، 1939ء، 1945ء)

(vii) دسمبر 1989ء تک اقوام متحدہ کے ممبروں کی تعداد کیا تھی؟

(15، 159، 185ء)

(viii) پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر----- میں بنا۔

(1947ء، 1948ء، 1949ء)

(ix) غیروابستہ ممالک کی تحریک کا قیام----- میں ہوا۔

(1955ء، 1961ء، 1964ء)

(x) پاکستان غیروابستہ تحریک کا ممبر----- میں بنا۔

(1947ء، 1955ء، 1979ء)

(xi) اسلامی کانفرنس کی تنظیم کی پہلی سربراہی کانفرنس----- میں ہوئی۔

(1947ء، 1969ء، 1974ء)

(xii) ایران میں اسلامی انقلاب----- میں رونما ہوا۔

(1964ء، 1979ء، 1981ء)

(ج) مختصر جواب دیجیے۔

1- پاکستان کن کن بین الاقوامی اداروں کا سرگرم رکن ہے؟

2- اقوام متحدہ کب قائم کی گئی؟

3- اقوام متحدہ کے اہم اداروں کے نام لکھیں۔

4- پاکستان اقوام متحدہ کا ممبر کب بنا؟

5- NAM کس کا مخفف ہے؟

6- غیروابستہ ممالک کے سربراہان مملکت کی کتنی کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں؟

7- اسلامی کانفرنس کی تنظیم کیوں بنائی گئی؟

8- اسلامی کانفرنس کی اہم ذیلی تنظیموں کے نام لکھیے۔

9- علاقائی تعاون برائے ترقی کی تنظیم کا نیا نام کیا ہے؟

10- علاقائی تعاون برائے ترقی نے صنعتی میدان میں تعاون کو فروغ دینے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟

11- اقتصادی تعاون کی تنظیم کے ممبروں کی تعداد اور نام تحریر کریں۔
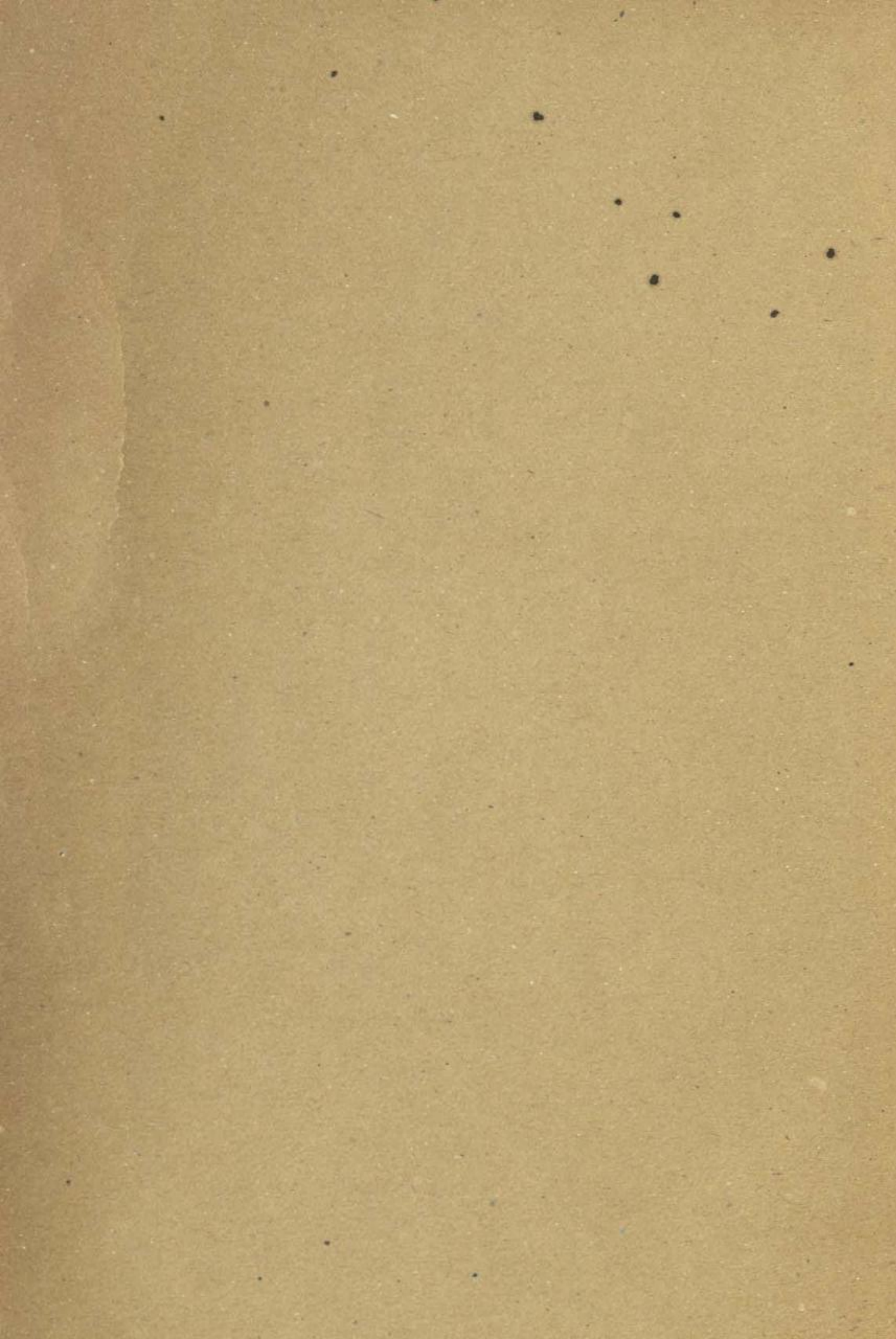
---

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور محفوظ ہیں

تیار کردہ : پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

منظور کردہ:- وفاقی وزارت تعلیم حکومت پاکستان اسلام آباد

بموجب مراسلہ نمبر ایف 5-84/2 ـ (ایس ایس)، بتاریخ 29 جنوری 1985ء

بحیثیت واحد نصابی کتاب برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز

فرمانِ قائداعظم

آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے۔ صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔ (نوجوانوں سے خطاب)

تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے

سیریل نمبر

3001

| ایڈیشن | طباعت | تاریخ اشاعت | تعداد | قیمت |
|---|---|---|---|---|
| دوم | سوم | مئی 1996 | 40,000 | 10.65 |